www.urducouncil.nic.in

مارچ 2018 قیمت:- /10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

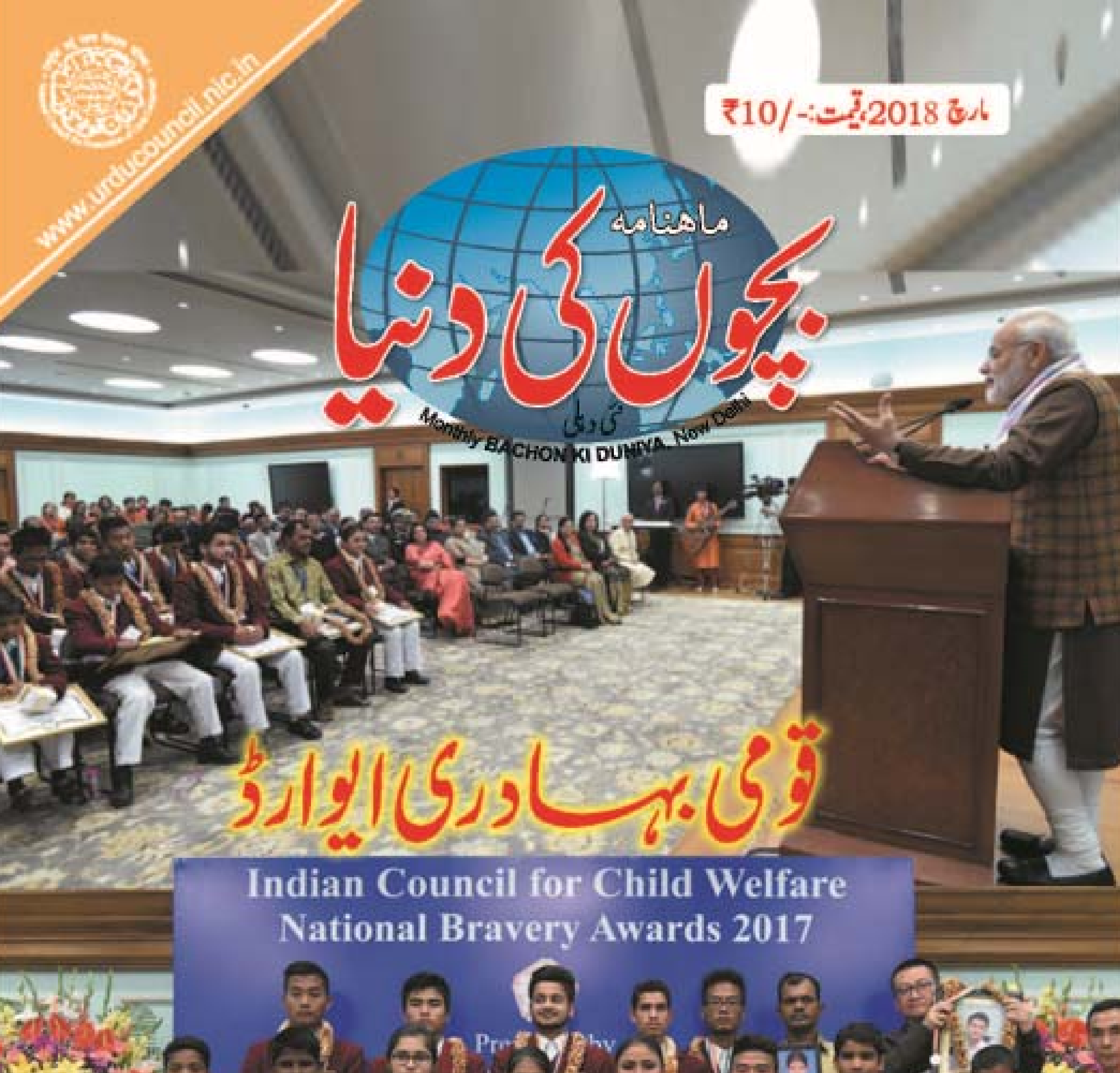

قومی بہادری ایوارڈ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

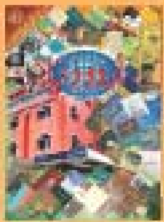

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

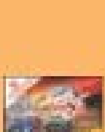

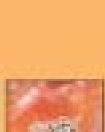

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 03 مارچ 2018

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10روپے، سالانہ/100روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages:64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL شعبہ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی - 110066
فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110 تھرڈ فلور، سالار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضمون	لاسلکی آنکھ: راڈار	بانو سرتاج	06
نظم	ہولی گیت	طارق منظور	11
مضمون	انسانی جسم کی اہم گلٹی	محمد زاہد	12
نظم	برے کام کا برا نتیجہ	مناظر عاشق ہرگانوی	14
مضمون	مولانا عبدالماجد دریابادی	ابرار احمد	15
نظمیں	گاؤں اور ریل	ابواللیث جاوید	19
	حوصلوں کی اڑان	ظفر کمالی	20
سیر کر دنیا کی	ڈزنی لینڈ میں ایک دن	جاوید دانش	21
نظم	اردو زبان ہماری	زبیر رضوی	28
کہانیاں	چاند اور بندر	ملک بزمی	29
	دو کہاوتیں	راشد جمال فاروقی	31
	بھوری، نیلی بکریاں	ابن آس محمد	33
باتصویر کہانی	کھانے کی کھیر	ذکیہ مشہدی	37
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	43
کہکشاں	دنیا کے وہ 6 مقامات	باغبان زینب رفیق	52
	سرحدی گاندھی	فیاض احمد	53
	سنہری باتیں	سعدیہ کوثر شیخ	55
	سنہرے موتی	سرفراز خان	55
ننھے فنکار	ہنسی کے غبارے		57
	ایمانداری اور صبر کا پھل	رمشا شیخ	58
	سچا دوست	انصاری اعجاز احمد	59
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! آپ سب جانتے ہیں کہ انسانی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے۔ اوپر والے نے ہمیں یہ زندگی اس لیے دی ہے کہ ہم دنیا میں اچھے کام کریں۔ کامیاب بنیں اور اپنے خاندان، اپنے علاقے اور اپنے ملک کا نام روشن کریں۔ زندگی ہمیں صرف ایک دفعہ ملتی ہے مگر مواقع بہت سارے ملتے ہیں، جن میں ہم اچھا یا برا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی زندگی اور وقت کا بہتر استعمال کرتے ہیں اور اپنا نام کامیاب لوگوں میں درج کرواتے ہیں جبکہ کئی لوگ اپنے وقت کا غلط استعمال کرتے ہیں اور زندگی میں ناکام رہتے ہیں۔ پرانے زمانہ سے ہی ہر انسان اپنے اپنے انداز میں زندگی گزارتا رہا ہے۔ ہر شخص کی الگ الگ خواہشیں، آرزوئیں، تمنائیں ہوتی ہیں۔ کوئی ایورسٹ پر چڑھنا چاہتا ہے تو کوئی آئی اے ایس کے امتحان میں کامیابی چاہتا ہے۔ کسی کو کرکٹ سے دلچسپی ہے تو کوئی ٹینس یا دوسرے کھیل میں کامیابی چاہتا ہے۔

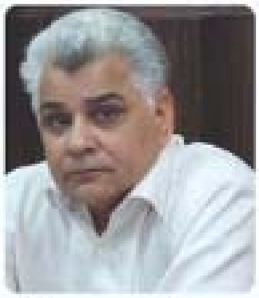

اس کامیابی کے لیے ہر انسان اپنی اپنی سطح پر کوشش کرتا ہے۔ ادھر کچھ برسوں میں نوجوانوں میں سیلفی کا جنون سوار ہو گیا ہے۔ لوگ خطرناک اسٹنٹ کرتے ہوئے سیلفی لیتے ہیں۔ کوئی ٹرین کے آگے سیلفی لے رہا ہے تو کوئی گہری کھائی یا سمندر کے کنارے۔ اسی طرح کوئی خطرناک جنگلی جانوروں کے ساتھ سیلفی لے رہا ہے تو کوئی اونچی پہاڑی سے۔ اس سیلفی نے کتنے لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ بہادری کے نام پر یہ بہت بڑی بیوقوفی ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ موتیں ہمارے ملک میں سیلفی سے ہوئی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں قبل حیدرآباد کے شیو کمار نامی ایک نوجوان نے سیلفی کی وجہ سے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی اور تیز رفتار ٹرین کے آگے سیلفی لینے میں اس کے سر، کندھے اور سینے میں سخت چوٹیں آئی ہیں۔ سوشل میڈیا پر اس کا ویڈیو بھی لوگ شیئر کر رہے ہیں جو بے حد ڈراونی ہے۔ یہ ساری باتیں یہاں لکھنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ آپ سب سیلفی جنون کا حصہ نہ بنیں اور اپنے مقصد کو سامنے رکھیں اور اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کریں۔

جہاں کچھ لوگ بیوقوفی یا حماقت میں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہیں وہیں کچھ بچے حقیقت میں بہادری کا مظاہرہ کر کے اپنے خاندان اور اپنے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس سال ایسے ہی 18 بچوں کو ہمارے وزیر اعظم نے قومی بہادری ایوارڈ سے نوازا ہے۔ ان میں 11 لڑکے اور 8 لڑکیاں ہیں۔ ان میں تین بچوں کو مرنے کے بعد یہ ایوارڈ دیے گئے جو ان کے اہل خانہ نے وصول کیے۔ وزیر اعظم نے اس موقعے پر کہا کہ ان کی بہادری سے دوسرے بچوں کو بھی حوصلہ ملے گا۔ انھوں نے سبھی ایوارڈ پانے والے بچوں، ان کے والدین اور استادوں کو مبارکباد پیش کی۔ اس سال قومی بہادری کا سب سے بڑا بھارت ایوارڈ آگرہ کی نازیہ کو دیا گیا ہے۔ اس بہادر لڑکی نے جوئے اور سٹے بازوں کے خلاف آگرہ میں مہم چھیڑی تھی اور ان کے اڈے بند کروا دیے۔ اس مہم میں انھیں مار کھانی پڑی۔ گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ ان کے والدین کو بھی دھمکیاں دی گئیں لیکن نازیہ نے ہار نہیں مانی اور آخر جیت ان کی ہوئی۔ اسی طرح اڑیسہ کی رہنے والی محض 6 سال کی ممتا دلائی نے اپنی بڑی بہن آستی کی مگرمچھ سے جان بچائی۔ پنجاب کے طالب علم کرن ویر سنگھ نے اسکولی بس کے ندی میں گرنے کے بعد 15 بچوں کی جانیں بچائی تھی۔ ان بچوں کے علاوہ رائے پور کی لکشمی یادو، کرناٹک کی نیترووتی ایم چوہان (مرحوم)، اتراکھنڈ کے پنکج سیموال، گجرات کی سمروھی، منی پور کی راجیشوری (مرحوم)، ناگالینڈ کی مانشا، چنگئی وانگسا، شینگ پان، یوکئی، لال چھندما، جوتو تو لنگا (میزورم)، اعجاز عبدالروف (مہاراشٹر)، پنکج کمار مہنت (اڑیسہ)، میگھالیہ کی بیتشواجان پین لانگ، لوکراکیشم چانو (مرحوم) اور کیرل کے سیبیسٹین ونسینٹ کو قومی بہادری ایوارڈ دیے گئے۔

'بچوں کی دنیا' کے ہر شمارے کو ہم بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ کی پسند کے مطابق سجاتے اور سنوارتے ہیں۔

اس شمارے میں بھی ہم نے آپ کے لیے معیاری تحریریں جمع کی ہیں۔ اب آپ 'بچوں کی دنیا' پڑھیں اور اپنے مشوروں اور تاثرات سے ہمیں آگاہ کریں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

’بچوں کی دنیا‘ پابندی سے مل رہا ہے۔ یہ ہر عمر والوں کے لیے ایک معلوماتی گلدستہ ہے۔ واقعی اتنی کم قیمت پر اس رسالے کو شائع کرنا بہت کمال کی بات ہے۔ جب بھی مجھے رسالہ ملتا ہے۔ پہلی ہی فرصت میں پڑھ جاتا ہوں۔

ریاض اللہ، منہاج نگر، جے پی نگر ڈاک، بنگلورو

مجھے بچپن ہی سے مطالعے کا بہت شوق ہے۔ ’بچوں کی دنیا‘ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی حاصل ہوگئی۔ اس میں بچوں کا ذہن بنانے کے لیے مضامین، کہانیاں، نظمیں، نصیحت آمیز واقعات وغیرہ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں بڑوں کے لیے ٹیپو سلطان، محمد علی کلے، سائنس داں عبدالکلام، گاندھی جی، نہرو جی، حکیم اجمل خاں جیسی نامور ہستیوں پر بھی معلومات ہوتی ہیں۔ بڑوں کی بڑی باتیں: حکیم بوعلی سینا، حکیم افلاطون وغیرہ بھی فکر انگیز ہیں۔

میں بھی ایک پرائمری ٹیچر تھا۔ اپنی 35 سال کی نوکری میں بچوں کو اخلاقی تعلیم سے نوازا۔ وہ سارے بچے آج کامیاب ہیں اور ماں باپ و استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔ میں تین سال سے ماہانہ خریدار ہوں۔ گھر میں لوگ بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔

عبداللہ جناب، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر، جالگاؤں، مہاراشٹر

’بچوں کی دنیا‘ ماہ نومبر 2017 کے اداریے میں خصوصاً یہ جملے لائق تحسین اور لائق عمل ہیں ”پانی اور بچے ہوئے کھانے کو ہم جس طرح برباد کرتے ہیں، وہ یقیناً درست نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بچے ہوئے کھانوں سے کسی غریب کا پیٹ بھریں۔“

علاوہ ازیں شمارہ ہذا میں درج ذیل پسندیدہ نثری عنوانات ہیں: تاڑ کے دو عجیب درخت (یقیناً اس موضوع کے ذریعے سید ضیاء الحسن نے ہمیں نئی دریافت سے روشناس کروایا ہے)۔ پتھروں کی دنیا، آنہ دو آنہ کھوٹا آنا، ریڈیو کا موجد (مارکونی) ابن سینا بابائے طب۔

منظومات میں درج ذیل موضوعات ٹھیک ہیں: پانی، تعزیتی کلام، لکڑی کا گھوڑا، میں کاغذ کی کشتی بہانے لگا، دنگل میں ہنگل، ان میں خصوصی طور پر نظم ’لکڑی کا گھوڑا‘ مجھے بہت پسند آئی۔

ننھے قلم کاروں کی کاوشات میں ’جابر بن حیان: ایک عظیم کیمیا داں‘ اور ’رحم دل لڑکی‘ خوب ہیں۔

اشفاق کارنجوی، جی۔ این۔ آزاد اردو ہائی اسکول، باڑے گاؤں، مہاراشٹر

میری چھوٹی بہن آمنہ خاتون بہت ہی ذوق وشوق کے ساتھ پچھلے دو سالوں سے رسالہ ’بچوں کی دنیا‘ پڑھ رہی ہے۔ اس رسالے کے ذریعہ انھوں نے بہت کچھ سیکھا؛ اردو لکھنا، پڑھنا، کہانی سمجھنا اور خاص کر مختلف النوع معلومات سے آشنا ہوئی۔

محمد حسین رضا، منسٹری آف آیوش، گورنمنٹ آف انڈیا، جنک پوری، نئی دہلی

بانو سرتاج

لاسلکی آنکھ: راڈار

راڈار، ریڈیو اینگل ڈیٹیکشن اینڈ رینجنگ (Radio Angle Detection and Ranging) کا مخفف ہے۔ جس کے معنی ہیں ریڈیائی لہروں کے ذریعے کسی چیز کا پتہ لگانا اور اس چیز کی سمت اور فاصلے کا تعین کرنا۔

لاسلکی آنکھ، رڈار ایک ایسا سائنسی آلہ ہے جو کم یا زیادہ Wave length کی ریڈیائی لہروں کو کھینچ کر کے Information Centre تک پہنچاتا ہے۔

- دور کے فاصلوں پر موجود جامد یا متحرک مادی اجسام سے ریڈیائی لہروں کا انعکاس کر کے ان اجسام کی ہیئت، فاصلہ، سمت اور رفتار بتانے کی اہلیت رکھتا ہے۔
- خلا میں داغے گئے Guided Missiles کی خبر دیتا ہے۔
- بحری جہازوں کی سمندر میں نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔
- ساحلوں سے بحری جہازوں کے فاصلے اور رفتار کا پتہ دیتا ہے۔
- فضا میں اڑنے والے طیاروں کی معلومات مہیا کراتا ہے۔

رڈار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ٹیلی گرافی کی طرح لاسلکی مواصلاتی نظام (Telegraphical Communication System) ہے۔ وہ فضا میں گرد و پیش کی خبر رکھتا ہے اس لیے اسے 'ریڈیائی آنکھ' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا استعمال مختلف شعبوں میں مختلف مقاصد کے تحت ہوتا ہے۔ یہ جنگ کے زمانے میں کام آتا ہے تو امن کے زمانے میں بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔

رڈار کی تاریخ بہت زیادہ طویل نہیں ہے:

- 1886 میں ہینرچ ہرٹز (Henrich Hertz) نے تجربوں کی بنیاد پر ثابت کیا کہ کسی متحرک یا جامد جسم سے ریڈیائی لہروں کا انعکاس ممکن ہے۔
- 1895 میں امپیریل رشین نیوی (Imperial Russian Navy) اسکول کے ماہر طبیعات الیکزنڈر پاپور (Alexander Papor) نے ایک ایسا برقی آلہ (electric Device) تیار کیا جو آسمانی بجلی کے ارتعاش کو

حساس پردے پر پیش کر دیتا۔

- 1897 میں اس آلے کی ترقی یافتہ شکل Spart Gap Trams mitter کی شکل میں سامنے آئی۔ ریڈیائی اشاروں (Radio Signals) کا کامیاب تجربہ بالٹک سمندر میں چل رہے دو جہازوں کے درمیان کیا گیا۔
- 1904 میں جرمن سائنسداں کرسٹیان ہولیس (Christian Holess) نے ریڈیائی اور الکٹرو میگنیٹک (Electromagnatic) لہروں کی مدد سے کافی فاصلوں پر موجود دھاتی اجسام سے اشارے حاصل کیے تھے۔ بعد ازاں اس آلے میں تبدیلیاں کی گئیں۔ اصلاح شدہ ترقی یافتہ آلہ کی مدد سے کہرے کی دبیز چادروں میں راستہ بھٹکے جہازوں کا پتہ چلانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک نوجوان انجینئر رابرٹ واٹسن واٹ (Robert Watson Watt) نے اس سائنسی آلے پر کافی تحقیق کی۔

جب واٹ، محکمہ موسمیات کے افسر تھے تب ان کی تحقیق کا آغاز ہوا۔ دوسری طرف فضائیہ محکمہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا پھر بھی ہوائی جہاز کے حادثوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ طوفان کی چپیٹ میں آکر اکثر جہاز برباد ہو جاتے۔ رابرٹ کسی ایسے آلے کی تلاش میں تھے جس سے صورت حال پر قابو پایا جاسکے۔

بجلی کی گرج کے ساتھ طوفان کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اس نکتہ سے واقف تھے۔ تجربوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بجلی کی گرج کو بے تار کے تار پر ریسیو کر کے حادثوں کو ٹالنا ممکن ہوسکتا ہے۔ وہ اسی سمت میں کام کرنے لگے۔

1934 میں رابرٹ 'ٹیڈی گنٹن' (Tediganton) کی ایک تجربہ گاہ میں بطور سائنس افسر کام کر رہے تھے۔ ان کو، جرمنوں کے ذریعے استعمال کی گئی 'موت کی کرنوں' سے متعلق معلومات اکٹھا کرنے کی ذمے داری سونپی گئی۔

'موت کی کرنوں' کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ رابرٹ نے ان خبروں پر اکتفا نہ کرتے ہوئے خود تحقیقات کرنے کا تہیہ کیا۔ 'موت کی کرنوں' کے بارے میں سائنس اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ وہ کرنیں کافی فاصلے سے لوگوں کو ختم کرسکتی ہیں، دھماکہ خیز مادوں کو برباد کرسکتی ہیں اور ٹینکوں اور جہازوں کو روک دینے کی طاقت رکھتی ہیں۔

رابرٹ واٹ نے جہازوں کو بادل، دھند اور اندھیرے سے بغیر کسی رکاوٹ کے گزارنے کے تجربے شروع کیے۔ اپنے ایجاد کردہ آلے کا تجربہ انھوں نے Diventory Radio Transamitter Centre سے دس میل کے فاصلہ پر ایک ...... میں کیا۔

تجربہ کامیاب ہوا۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ:

- اڑتے ہوئے جہاز کی گونج (Echo) کو زمین سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔
- اس کے مطابق جہاز کے ڈینے (Wings) کرۂ ہوا میں ایک طرح کے حافظتی تاروں کا کام کرتے ہیں، اور
- جب ان پر ایک طاقتور بے تار بھیجا جاتا ہے تو ڈینے، لہروں کو منعکس کر دیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آئینہ روشنی کی کرنوں کو منعکس کر دیتا ہے۔

راڈر کو مزید طاقت ور بنانے کے لیے طاقتور صدائے بازگشت (Echo) حاصل کرنا ضروری تھا، اس کے لیے نہایت چھوٹا، ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصہ جتنا Pulses پیدا کرنے کے

لیے ایک اعلیٰ درجہ کے ٹرانسمیٹر کی ضرورت تھی...

راڈر کے لیے ٹرانسمیٹر اور ریسیور بنا لیا گیا۔

1935 کے بعد ہی راڈر نظام رائج ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اُس نے قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ اتحادی افواج نے راڈر نظام کا استعمال کر کے جرمن طیاروں کا مقابلہ کیا۔ حالانکہ جرمن طیارے اتحادی طاقتوں کے طیاروں کے مقابلے میں تعداد میں زیادہ اور عمدہ تھے پھر بھی بم برسانے والے ان کے طیاروں سے برطانیہ کو محفوظ رکھنے میں رڈار نظام کا نہایت اہم حصہ تھا۔

1942 میں رابرٹ واٹسن واٹ کو رڈار کی ایجاد کے لیے نائٹ (knight) کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

رڈار کی قسمیں: رڈار کی قسمیں درج ذیل ہیں:

Types of Radar

- Commercial Marine Radar
- Navy Traffic - Control Radar
- Police-Force Radar
- Geological Radar
- Bird-Study Radar
- Air-Force Radar

- کامرشیل میرین راڈر، گہرے کہرے سے ڈھکے سمندروں میں جہازوں کے تصادم کو کم کرتا اور انھیں صحیح سمت کا پتہ دیتا ہے۔
- بحریہ ٹریفک کنٹرول راڈر، سمندر میں چلنے والے مختلف جہازوں کے راستوں، اُن کی رفتار اور سمت کا تعین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ زیر آب خطرناک چٹانوں سے Navigators کو آگاہ کرتا ہے۔
- پولس فورس راڈر، راستوں خصوصاً شاہراہوں پر ٹریفک کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس طریقے کے رڈار کو Police-Force Radar Gun کہا جاتا ہے۔ ریلوے ٹریفک کنٹرول کرنے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔
- ارضیاتی رڈار، موسمی کیفیت اور موسم کی تبدیلیوں کی خبر دیتا ہے۔ اس طریقے کے رڈار کی مدد سے موسمی چارٹ اور پیش گوئیاں Weather Forecast تیار کی جاتی ہیں۔
- پرندوں کی نقل مکانی کا مشاہدہ کرنے والوں کے لیے رڈار ایک اہم ایجاد ہے۔ اس کے ذریعہ ایک ہی جگہ سے پرندوں کے نقل مکانی راستوں کی اسٹڈی جا سکتی ہے۔
- فضائیہ رڈار جہاز کے پائلٹ کو گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مدد کرتا ہے۔ طیارے کی لوکیشن جاننے میں بھی رڈار کی مدد لی جاتی ہے۔

فضائیہ رڈار کی لہریں خلا تک جا سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں سب سے پہلے امریکہ نے کامیابی حاصل کی تھی۔ 4 فروری 1946 کو امریکہ کی Signal Core نے چاند تک ریڈیائی لہریں بھیجیں اور واپس وصول کی تھیں۔ اس کام میں صرف ڈھائی سیکنڈ کا وقفہ لگا تھا۔ اس کے بعد سے خلائی سائنس (Space Science) میں رڈار اور اس کے استعمال کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔

رڈار کے اجزا: رڈار کے پانچ اجزا بے حد اہم ہیں:

راڈار کے اجزا

- Transmitter
- Dish Antena
- Doppler Effect
- Receiver
- Radar Jet

- ٹرانسمیٹر ریڈیو اسٹیشن کی طرح کام کرتا ہے۔ یہ Object سے ریڈیائی لہریں Catch کرکے انھیں ریڈیائی اشاروں (Radaio Signals) میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ عمل Electromagnetic Waves کے سبب ممکن ہوتا ہے۔ پھر ان اشاروں کو حساس پردے پر ریسیو کر کے معلومات حاصل کرتا ہے۔
- انٹینا اُس آلے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے لاسلکی پیغام (Telegraphic Message) فضا یا خلا میں منتشر کیے جاتے یا حاصل کیے جاتے ہیں۔
- لاسلکی پیغام ریڈیو یا ٹیلی ویژن یا لاسلکی ٹیلی فون، رڈار نظام یعنی کسی بھی نظام کے ہوسکتے ہیں۔
- پیغام بھیجنے والا اور پیغام وصول کرنے والا انٹینا الگ الگ ہوتا ہے۔

یہ آلہ ریڈیائی لہروں کو پکڑتا ہے۔ اگر سگنل کمزور مل رہے ہیں تو طاقتور ایمپلی فائر کی مدد سے انھیں قوی اور شدید بنا کر Receptor پر لاتا ہے جس سے پیغام کا حصول جلد اور ممکن ہوجاتا ہے۔

رڈار میں پیغامات بھیجنے اور وصول کرنے والا انٹینا ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک انٹینا سے لہریں فضا میں بھیجی جاتی ہیں جو نشانے سے ٹکرانے کے بعد اسی انٹینا پر واپس آجاتی ہیں۔

- ڈوپلر افیکٹ کو راڈر کی 'ریڑھ کی ہڈی' کہا جاتا ہے۔ متعلقہ اجسام، جن سے اشارے موصول ہوتا ہوں اور وہ رینج کے باہر ہوں، متحرک ہوں، کمزور ہوں تو ڈوپلر انھیں ٹرانسمیٹر رینج میں لاکر خامیاں دور کرتا ہے۔
- ریسیور ٹیلی ویژن سیٹ کی طرح کام کرتا ہے۔ لوٹی ہوئی لہروں کو تصویر کی شکل دیتا ہے۔
- راڈر جیٹ، ریڈیائی لہریں بھیجتا ہے۔ لہروں کے واپس لوٹنے میں کتنا وقت لگا، یہ بتاتا ہے۔

راڈر سسٹم دو طرح کا ہوتا ہے، وقفہ جاتی لہروں کا نظام (Pulse Type Radar) اور دوسرا متواتر چلنے والی لہروں کا

نظام (Continuous Wave Radar)۔ دونوں نظاموں کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی ریڈیائی لہریں ہر سمت بھیجی جاتی ہیں۔ یہ لہریں جب کسی شئے سے ٹکراتی ہیں تو کچھ لہریں واپس آجاتی ہیں۔ یہ Electric magnetic ہوتی ہیں جن پر موسم اثر انداز نہیں ہوتا۔ فضا صاف ہو یا اس پر دھند چھائی ہوئی ہو، آسمان صاف ہو یا کالے بادلوں سے بھرا ہوا ہو، رڈار ہر وقت اطمینان بخش نتائج دیتا ہے۔

وقفہ جاتی لہروں کے نظام میں ریڈیائی لہریں وقفے وقفے سے بھیجی جاتی ہیں۔ ان وقفوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک یونٹ ہوتا ہے جو ٹائمنگ یونٹ (Timing Unit) کہلاتا ہے۔ اس یونٹ میں سے جب کرنٹ نکلتا ہے اور Modulater میں پہنچتا ہے تو پلس تیار ہوتا ہے۔

پلس (Pulse) کا مطلب ہے ایک موقع پر انتہائی قلیل وقفہ کے لیے وولٹیج Voltage کا اچانک زیادہ ہو کر پھر اپنی سابقہ حالت پر آجانا۔ ٹائمنگ یونٹ اور پلسر کا عمل دونوں باہمی طور پر مربوط ہوتے ہیں۔

ٹائمنگ یونٹ میں اچانک وولٹیج بڑھتا ہے اور پھر سابقہ حالت پر آجاتا ہے۔ اسی وقت پلسر (Pulser) بھی ایک پلس تیار کرتا ہے۔ پلسر سے تیار شدہ پلس آسی لیٹر میں پہنچتی ہے اور وہیں اصلی برقی مقناطیسی (Electric Magnetic) لہریں تیار ہوتی ہیں۔

آسی لیٹر میں پلس کے پہنچنے پر لہریں پیدا ہوتیں اور پلس کے ختم ہونے پر لہریں تیار ہونا بند ہو جاتی ہیں۔

آسی لیٹر سے تیار شدہ لہریں انٹینا میں بھیجی جاتی ہیں۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ بھیجی جانے والی لہریں اسی راڈر کے ریسیور میں نہ پہنچ جائیں۔ انھیں رڈار کے ریسیور میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے ڈپلیکس (Duplex) کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈپلیکس (Duplex) ایک خاص آلہ ہوتا ہے جو دو اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا ٹرانسمٹ ریسیور (Transomit Receiver (TR) اور دوسرا اینٹی ٹرانسمٹ ریسیور (Anti-Transmit Receiver (AIR) ٹرانسمٹ ریسیور بھیجی جانے والی لہروں کو ریسیور میں داخل ہونے سے روک کر فضا میں منتشر کر دیتا ہے۔

انٹینا Antena محور کے چاروں طرف گردش کرتا رہتا ہے تاکہ ہر سمت لہریں بھیج سکے۔ ٹی وی اسکرین جیسے ایک اسکرین Screen پر ایک چمکدار لکیر گردش کرتی رہتی ہے۔ اس کی گردش تب رکتی ہے جب لہریں فضا میں کسی چیز سے ٹکراتی ہیں۔ (کچھ لہریں ٹکرانے کے بعد لوٹ جاتی ہیں) باقی لہروں سے نشانے کی پوزیشن اور سمت اسکرین پر دکھائی دیتی ہیں۔

واپس لوٹنے والی لہریں اس شئے سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں کہ وہ شئے متحرک ہے یا ساکت ہے؟ اگر متحرک ہے تو کس سمت میں جارہی ہے؟ اس کی رفتار کتنی ہے؟

جنگ کے دوران دشمن ملک کے طیاروں کی پوزیشن جاننے کے لیے اور زمانہ امن میں طوفانوں کی آمد نیز دوسری مصیبتوں، آفتوں سے آگاہی اور پھر امدادی انتظامات کے لیے رڈار کی مدد قابل تعریف ہے۔

■

Dr. Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines
Chandrapur - 442401 (Maharashtra)

طارق منظور

ہولی گیت

گملے میں امرود لگایا، پھلی ہے جس میں مُولی
انہونی باتوں کو لے کر اب کے آئی ہولی

عجوبہ ہے نا بھائی
کہو ہاں ،ہولی آئی

پچھلے سال گئے تھے بھیا! پھاگن میں ہم دلّی
مرغی کے انڈے سے نکلی میاؤں کرتی بلّی

عجوبہ ہے نا بھائی
کہو ہاں، ہولی آئی

بوڑھا بندر پی گیا دیکھو کئی بالٹی بھانگ
سر تو ٹکرایا دھرتی سے آسمان میں ٹانگ

عجوبہ ہے نا بھائی
کہو ہاں، ہولی آئی

روٹی سب کو ناچ نچائے، بھوک میں وہ تاثیر
بھوکا کوا بنا رہا ہے، روٹی کی تصویر

عجوبہ ہے نا بھائی
کہو ہاں ،ہولی آئی

شہروں شہروں دھوم مچی ہے گاؤں میں ہُڑدنگ
ہاتھی دادا سونڈ میں بھر کے ڈالیں سب پر رنگ

عجوبہ ہے نا بھائی
کہو ہاں ،ہولی آئی

■

TariqManzoor
H. No.: 501, Chhajjapur (North), Post: Tanda
Distt.: Ambedkar Nagar - 224190 (UP)

محمد زاهد

انسانی جسم کی اہم گلٹی۔ تھائی رائیڈ

پیارے بچو! انسان کا جسم ایک کارخانہ ہے جس میں طرح طرح کی چیزیں موجود ہیں۔ آنکھ، کان، ناک، دل، پھیپھڑا، ہاتھ، پیر وغیرہ کے ساتھ متعدد چھوٹی چھوٹی گلٹیاں ہیں جن سے نکلنے والا رس ان اعضا کے افعال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ سارا نظام دماغ کے ماتحت کام کرتا ہے۔ کسی کے قد کا بڑا ہونا یا چھوٹا ہونا، کسی فرد کو جلد غصہ آنا اور کسی کا پرسکون رہنا، کسی شخص کا جرم کرنا اور کسی کا باز رہنا وغیرہ کے پیچھے ان گلٹیوں کی قوت کام کرتی ہے۔

انسان کے جسم میں دو طرح کی گلٹیاں (غدود) پائے جاتے ہیں۔ پہلی نلی دار گلٹی جیسے لعاب دہن، جگر، لبلبہ وغیرہ جن سے نکلنے والا رس نلی کے ذریعے وہاں تک پہنچتا ہے جہاں اُسے کام کرنا رہتا ہے۔ دوسری بے نلی گلٹیاں جن سے نکلنے والا رس (ہارمون) خون میں شامل ہو کر ان عضو تک جاتا ہے جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے جیسے Pituitary، Thyroid، Testes وغیرہ۔

ہارمون (Harmone) یا کیمیائی رس کا پتہ Bayliss نامی سائنس داں نے سب سے پہلے 1902 میں لگایا تھا۔ یہ تھوڑی مقدار میں خارج ہوتے ہیں اور اپنے مخصوص عضو پر ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ اپنا کام کرنے کے بعد جسم سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اس رس کو جمع کرکے نہیں رکھا جاسکتا۔ ایک گلٹی سے کئی ہارمون خارج ہو سکتے ہیں لیکن ہر ایک کا عمل الگ ہوتا ہے۔

ہارمون کو کیمیائی خبر رساں Chemical Messenger ان معنوں میں کہا جاتا ہے کہ وہ جسم کے ایک مقام سے خارج ہو کر دوسرے مقام کے خلیوں کو کسی خاص کام کے کرنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کیمیائی مددگار Chemical Co-ordinator کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ یہ جسم کے مختلف اعضا کے درمیان تال میل قائم

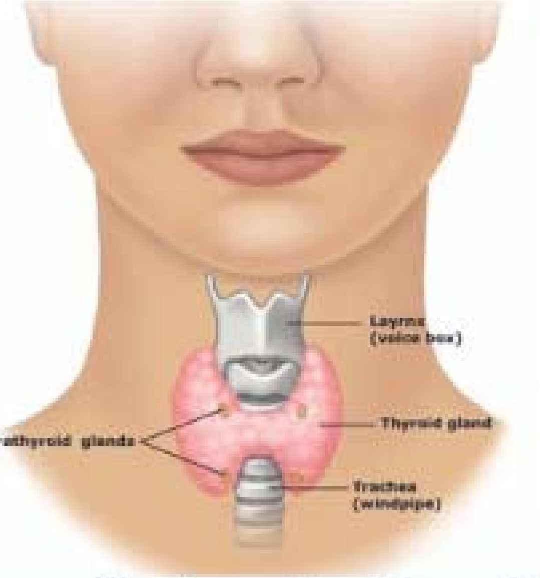

کرنے میں مدد کرتا ہے جس سے پورا جسم اکائی کی صورت میں کام کرتا ہے۔

تھائی رائیڈ (Thyroid) ہارمون خارج کرنے والی ایسی ہی ایک گلٹی ہے جو انسان کے گلے میں سانس کی نلی (Trachea) کے دونوں جانب موجود ہوتی ہیں۔ یہ دونوں حصے الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ ایک پتلے حصے (Isthmus) کے ذریعے آپس میں ملے رہتے ہیں۔ عام آدمی میں اس کا وزن 20 سے 40 گرام تک ہوتا ہے۔ اس سے تین طرح کے ہارمون نکلتے ہیں۔ ایک تھائی روکس (Thyroxin) دوسرا ٹرائی آیوڈ تھائرونین اور تیسرا تھائرو کیلسی ٹونین۔

تھائی رائیڈ (Thyroid) گلٹی اگر کم کام کرتی ہے تو اسے Hypothyroidism کہتے ہیں۔ اس میں انسان کے دل کی دھڑکن کم ہوجاتی ہے۔ آنتوں میں جلن ہوتی ہے اور توانائی کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ اس حالت میں تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ یادداشت کمزور ہوجاتی ہے۔ جلد اور بال سوکھے سوکھے لگتے ہیں۔ قبض کی شکایت ہوجاتی ہے۔ تھائی رائیڈ گلٹی اگر ضرورت سے زیادہ کام کرتی ہے تو اسے Hypothyroidism کہا جاتا ہے۔ اس میں دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ وزن کم ہوجاتا ہے۔ آدمی گرمی محسوس کرتا ہے اور پسینہ کا اخراج زیادہ ہوتا ہے۔

جو لوگ دل کی بیماری کا شکار ہوتے ہیں انھیں تھائی رائیڈ کی جانچ بھی کرانی چاہیے۔ خون میں موجود TSH, T3&T4 ہارمون کی مقدار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی کولیسٹرول (Cholesterol) اور شکر (Glucose) کو بھی چیک کرانا چاہیے۔

تھائی رائیڈ سے نکلنے والا ہارمون تھائی روکسین بہت اہم ہے۔ بچپن میں اگر یہ کم خارج ہوتا ہے تو آدمی بونا پن (Cretinsm) کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ میکزی ڈیما (Myxoedema) نامی بیماری جس میں مریض کا چہرہ پھول جاتا ہے اور گلے میں گھینگ کا مرض (Simple Goiter) بھی ہوسکتا ہے جس میں تھائی رائیڈ گلٹی خود ہی بڑی ہوجاتی ہے۔ زیادہ تھائی روکسین خارج ہونے سے (Grave's Disease) ہوتی ہے۔ اس بیماری میں آنکھیں باہر کی طرف نکل آتی ہیں۔ پلکوں کا جھپکنا کم ہوجاتا ہے اور مزاج میں تیزی آجاتی ہے۔

آج کی تیز رفتار مشینی زندگی میں اکثر لوگ Hypothyroidism کا شکار بنتے ہیں۔ عورتوں میں بانجھ پن کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔ ہم سب کو بچپن سے صحت کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ وقت رہتے بیماریوں کا علاج ہوسکے۔

■

Dr. Md. Zahid
B-5, Garden Reach
Kolkata - 700024 (West Bengal)

مناظر عاشق ہرگانوی

برے کام کا برا نتیجہ

کہانی دادی اماں نے سنائی
کہ جس سے رات گہری نیند آئی
ہوا بیدار بھی کچھ دیر ہی سے
جگایا بھی نہیں مجھ کو کسی نے
نہا کر ناشتہ کچھ جلد کھایا
بڑی تیزی سے یونیفارم پہنا
بجا پھر ہارن بھی اسکول بس کا
جگہ لی اس میں اور اسکول پہنچا
وہاں لیکن الگ اک ماجرا تھا
کہ چور اسکول میں پکڑا گیا تھا
گھڑی دفتر کی، کمپیوٹر چرایا
لیے سامان باہر جیسے نکلا
جو دیکھا گارڈ نے تو دھر دبوچا
رنگے ہاتھوں ہی وہ پکڑا گیا تھا
چرائے تھے جو ساماں، ساتھ ہی تھے
وہ کرتا جرم سے انکار کیسے
اسے کمرے میں شب بھر بند رکھا
لگایا جس میں اک مضبوط تالا

خبر سن کر پرنسپل آگئے بھی
خبر تھانے کو کروی سامنے کی
پنہائی ہتھکڑی آکر پولس نے
گئی پھر ساتھ لے کر اس کو تھانے
ترقی گارڈ کو پھر دی گئی تھی
کہ اس نے خوب کی تھی اپنی ڈیوٹی
برے کاموں سے بچنا چاہیے بھی
کہ راس آئی نہیں ہرگز برائی
کمائی ہوتی ہے محنت کی جتنی
وہی سچی خوشی انساں کو دیتی
برے کاموں سے رب میرے بچانا
یہ ہے میری دعا، میری تمنا

■

Prof. Manazir Ashique Harganvi
Kohsaar, Bhikanpur-3
Bhagalpur - 812001 (Bihar)

ابرار احمد

مولانا عبدالماجد دریابادی

(1892-1977)

دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن

بچو! آپ نے مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام سنا ہوگا۔ وہ صحافی و مدیر، قلم کار و مضمون نگار، شاعر و ادیب، مؤلف و خطیب، عالم و فلسفی سبھی کچھ تھے۔ جدت پسند بھی تھے اور مذہب پسند بھی۔ وہ ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے، والدہ بھی لکھنؤ کے ایک بڑے گھر کی خاتون تھیں اور والد گرچہ دیکھنے میں مولوی قسم کے انتہائی شریف انسان لگتے تھے، مگر وہ انگریزی سرکار میں افسر تھے۔ وہ ایک باوقار عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر فائز علاقے کی محترم شخصیت تھے، علاقے کے رئیس اور زمین دار، گھر میں ہر قسم کا آرام تھا، نوکر چاکر کی کثرت تھی، پہننے، اوڑھنے اور کھانے پینے کی فراوانی الگ تھی، مگر مولانا دریابادی نے 'پدرم سلطان بود' کے جاگیردارانہ طرز کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی، بلکہ اپنی محنت اور لگن کے سبب علم و ادب کی دنیا میں اپنی پہچان خود بنائی۔ وہ ڈپٹی زادہ تھے اور لوگ باگ انھیں 'چھوٹا ڈپٹی' بھی کہتے تھے، مگر مالک و آقا، چھوٹا اور بڑا، شریف یا رذیل کا غرور مولانا کے سر میں نہیں سمایا کہ اپنے بچپن کی عمر کو رئیس زادگی، کھیل کود اور سیر سپاٹے میں ضائع کردیں، جیسا کہ بڑے گھر کے بچے کرتے ہیں۔ انھوں نے بچپن میں ہی یہ ٹھان لیا تھا کہ انھیں علم و فن اور شعر و ادب کی دنیا میں اپنا نام روشن کرنا ہے اسی لیے انھوں نے بچپن سے ہی اپنے وقت کو مفید کاموں میں استعمال کرنا شروع کردیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مارچ 1892 میں دریاباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ڈپٹی کلکٹر باپ کی پیاری اولاد، پیدائش پر گھر میں خوب دھوم دھام ہوئی۔ چوتھے سال میں ہی ایک مولوی صاحب کے ہاتھوں عزیز و رشتہ دار کی موجودگی میں ان کی بسم اللہ کی تقریب منعقد ہوئی اور بڑی شان بان سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، تعلیم کا نصاب مسلم گھرانوں میں وہی قدیم ڈھرے پر چل رہا تھا۔ قاعدہ بغدادی، قرآن مجید ناظرہ، اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم۔ حساب جغرافیہ۔ زیادہ اچھے گھر کا ہے تو گھریلو تعلیم کے بعد اسکول اور کالج میں داخلہ۔ جو اس وقت معاشی زندگی کی بہتری کے لیے ضروری تھا۔ مولانا دریابادی نے بھی گھر کی مشرقی اور روایتی تعلیم سے لے کر اسکول اور کالج کی زندگی کا منہ دیکھا، 1908 میں میٹرک کیا اور اس کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے لگے، انٹر، بی اے اور علی گڑھ سے ایم اے

اعلیٰ نمبرات سے پاس کیا۔

مولانا دریابادی ابتدا سے ہی پڑھنے لکھنے میں تیز تھے۔ بچپن میں ہی ابتدائی تعلیم کے وہ سارے مرحلے بخوبی اور جلدی طے کرلیے، جنھیں طے کرنے کے لیے دوسرے بچے کافی وقت لیتے ہیں۔ قاعدہ بغدادی کے بعد قرآن مجید ناظرہ، قرآن کی چھوٹی سورتوں کا حفظ، کریما اور گلستاں وغیرہ کے اشعار پانچ چھ سال کی عمر میں ہی یاد کرلیے۔ چھ سال کی عمر سے ہی وقت کی پابندی کا ہنر سیکھ لیا تھا، پابندی سے صبح اور دوپہر کے اوقات میں درس لیتے۔ تختی لکھتے، پڑھنے کا شوق اتنا تھا کہ شروع سے ہی ہر چیز کو یاد کرلینا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ اسی چھ سال کی عمر میں انگریزی سے بھی شناسائی بڑھانے لگے۔ وہ نماز پنج گانہ کے بھی چھ سات سال کی عمر میں ہی عادی ہوگئے تھے۔ اردو کی تعلیم کے لیے بھی انھوں نے کسی اور کتاب کا سہارا نہیں لیا، بلکہ وہی مولوی اسماعیل میرٹھی والی کتاب، اس کے پانچوں حصے انھوں نے بچپن میں ہی پڑھ لیے۔

دوسرے بچوں کی طرح انھوں نے بھی بچپن میں جم کر کھیلا، فٹ بال بھی اور کرکٹ بھی، تھیٹر بھی دیکھا، عجائب خانہ اور میوزیم بھی گئے، دوڑ کے مقابلے میں بھی شرکت کی، رسے کی کھنچائی بھی کی، مگر کھیل کود کا یہ شوق صرف اسکولی زندگی تک رہا، کالجی زندگی میں آتے ہی وہ کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ اور لائبریوں کے چکر کاٹنے میں مشغول ہوگئے۔ اس کچی عمر میں بھی شام کا جھٹپٹا ہو کہ صبح کا دھندلکا، انھیں سب سے زیادہ پڑھنے کا دھیان رہتا تھا۔ اسکول سے واپس آکر بچے عام طور پر ناشتے اور کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں، مگر مولانا دریابادی سب سے پہلے گھر میں آئے ہوئے اخباروں پر گرتے۔ کھا بھی رہے ہیں اور اخبار بھی نظر کے سامنے ہے۔ یہ تھا ان کا پڑھائی کا شوق۔ کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار غرض جو چیز بھی چھپی ہوئی نظر کے سامنے پڑتی، ممکن نہ تھا کہ وہ بے پڑھے رہ جائے۔ اس کو پہلی فرصت میں پڑھنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ 1898 میں، محض چھ سال کی عمر میں، بڑے بھائی عبدالحلیم کے ذریعے اخباروں اور رسالوں سے دلچسپی لینے لگے۔ 7 سال کی عمر میں ہی قرآن پاک ناظرہ مکمل کرلیا اور قرآن کی کچھ سورتیں بھی زبانی یاد کرلیں۔ پھر آمد نامہ، چند نامہ، گلزار دبستاں، گلستاں اور بوستاں وغیرہ۔ انگریزی میں بھی اسی عمر میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ انگریزی اخبارات کا سمجھے بے سمجھے مطالعہ کرنے لگے۔ اس عمر میں کچھ پڑھنا ہی مشکل ہوتا ہے، مگر وہ خط لکھنے لگے۔ اسی نوعمری میں 1897 میں ہی انھوں نے ایک ٹیڑھا میڑھا خط لکھا تھا، جس میں اپنے نام کے ساتھ انھوں نے شیر کا لقب استعمال کیا تھا۔ 1900 میں ان کی عمر کل آٹھ سال تھی کہ صوبہ اترپردیش کے ایک ہندی نواز لیفٹیننٹ گورنر نے اردو رسم الخط پر ضرب لگائی اور دیوناگری رسم الخط کے دروازے کھولے۔ جس کے احتجاج میں کئی جلسے لکھنؤ میں ہوئے، ننھے قلم کار مولانا دریابادی نے اس کے متعلق دو لمبے لمبے خط باندہ کے ایک ہم عمر کو لکھ کر بھیجے۔

مولانا کا گھرانہ پڑھا لکھا تھا، انھوں نے گھر میں ہی رسالوں اور اخباروں سے تعلق قائم کرلیا۔ کوئی خلاف عقل و نقل بات دیکھتے یا پڑھتے تو ان کا خون کھول جاتا اور اس کا جواب لکھنے کی اپنی سی کوشش اسی نوعمری میں کرتے۔ اس وقت کے روشن خیالوں نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف کچھ اعتراض کیا تو جب کہ وہ ابھی ساتویں کلاس کے طالب علم تھے اور عمر بھی کوئی گیارہ بارہ سال تھی، اس کا جوں توں کرکے جواب لکھا اور والد ماجد کے ڈر کے مارے، فرضی نام سے اس

وقت کے اودھ اخبار میں چھپوایا۔ 1904 میں ان کا یہ پہلا مضمون تھا جو اس وقت کے نامور اخبار کی زینت بنا۔ اس مضمون کے چھپنے سے ان کی جھجک ختم ہوگئی اور مضامین کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ اسکولی زندگی سے ہی انگریزی میں بھی مضمون نگاری شروع کردی تھی۔ وہ تقریر اور بول چال میں ذرا شرمیلے تھے، مگر تحریر میں وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی ممتاز تھے۔ کئی تحریری مقابلوں میں حصہ لیا۔ بی اے کے پہلے سال برطانوی فلسفی و مفکر اسٹیورٹ جان مل پر 30 صفحات کا انگریزی میں مقالہ لکھا اور اس کو پہلا انعام ملا۔ بی اے میں Essay Writing کے گھنٹے میں مولانا کا نمبر ہمیشہ اول رہتا۔ ولایتی پرچوں میں بھی ان کے انگریزی مضامین اسی زمانے میں چھپے۔ Nature جیسے غیر ملکی ہفتہ وار رسالے میں نفسیات کے موضوع پر ان کا مراسلہ چھپا اور ماہر نفسیات پروفیسر میک ڈوگل نے اس کا جواب بھی لکھا۔ پندرہ سال کی عمر میں ہی انڈین ٹیلی گراف (لکھنؤ) اور پانیئر الہ آباد جیسے معیاری انگریزی اخبار میں ان کی رپورٹ اور مراسلے چھپے۔ یہ تو انگریزی کی بات ہوئی، اردو میں بھی ان کی مضمون نویسی اسی وقت مشہور ہوگئی تھی اور اس وقت کے نامور رسالے ان کے مضامین کے انتظار میں پلکیں بچھائے رہتے تھے۔ 1910 میں اخباروں کے لیے کتابوں پر تبصرے بھی خوب لکھے۔ گویا ان کی تنقیدی صلاحیت بھی اسی زمانے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ الناظر لکھنؤ، ادیب الہ آباد، العصر لکھنؤ میں ان کے تبصروں کی دھوم مچ گئی۔ اسی کم سنی میں، جب کہ مضمون کی دو سطریں بھی چھپوانا دشوار، انھیں نقد معاوضہ بھی فی صفحہ ایک روپے کے حساب سے دیا گیا۔ 1911 میں ہی الندوہ جیسے معیاری اردو رسالے کے لیے کئی مضامین کے ترجمے کرکے بھیجے۔ اس وقت ان کی عمر محض سولہ سترہ سال تھی۔ اترپردیش سے پہلا مسلم روزنامہ 'ہمدم' جالب دہلوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تو اس کے پہلے شمارے میں ان کا لمبا مضمون شائع ہوا۔ 1918 میں ماہ نامہ صبح امید میں ان کا ایک مضمون 'ہندو مصنفین اردو' خوب مقبول ہوا۔ 1916 میں دارالمصنفین سے ماہ نامہ معارف شروع ہوا تو اس کے لیے کئی ترجمے، بے شمار تبصرے اور کئی نوٹ لکھے اور 1919 سے تو باضابطہ مولانا دریابادی کے لیے اس معیاری رسالے میں چند صفحات مخصوص ہوگئے۔ خلاصہ یہ کہ بیس سال کی عمر میں ہی انگریزی اور اردو دونوں زبان میں، انھوں نے مضمون نگاری، ترجمہ وتبصرہ اور تصنیف وتالیف کی دنیا میں اپنی پہچان بنالی تھی۔ مضمون نگاری سے دل چسپی نے تصنیف کا روپ اختیار کرلیا اور اسکول کے آٹھویں درجے میں کتاب لکھ ڈالنے کا شوق انگڑائی لینے لگا۔ اور آخرکار پہلی کتاب ڈھائی سو صفحات کی 'فلسفۂ جذبات' کے عنوان سے 1913 میں شائع ہوئی اور اس کا معاوضہ بھی انجمن ترقی اردو کی طرف سے فی صفحہ ایک روپے کے حساب سے ملا۔ اگلے سال فرائض والدین کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ شعروشاعری سے زیادہ شغف نہ تھا، اسکولی زندگی میں بھی تک بندی کرتے تھے، مگر انھوں نے کالج کی زندگی میں شاعری بھی شروع کردی تھی، اس عہد کی کئی غزلیں اور نظمیں یادگار ہیں۔

اسکول کے زمانے میں علمی سرگرمیوں اور بحث ومباحثہ کے علاوہ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ وہ تھیٹر بھی دیکھ چکے تھے کہ یہ اس زمانے میں سینما سے بہت مختلف تھا اور شرافت ودیانت کے خلاف نہ سمجھا جاتا تھا۔ آٹھویں درجے میں انھوں نے خود ایک ڈرامے میں کردار ادا کیا۔ مولانا دریابادی نے اس میں ڈاکوؤں کے سردار کا پارٹ

ادا کیا اور ان کے پارٹ کی دھوم مچ گئی۔ اسکول میں خوب چرچا ہوا۔ نویں دسویں میں ڈپٹی کمشنر کے سامنے انگریزی میں مکالمہ ہوا۔ جنگل میں بھٹک جانے والے بادشاہ کا کردار مولانا نے ادا کیا۔ اس پر بھی خوب واہ واہ ہوئی۔ مولانا کو Psychology، فلسفہ اور منطق سے زیادہ دل چسپی تھی، اس موضوع پر کالج کی لائبریری کے سوا باہر سے بھی کتابیں منگوا کر پڑھیں۔ منگوا نہ سکے تو کسی دوست رشتہ دار سے مانگ کر پڑھنے کی کوشش کی۔ کتابوں سے انھیں اتنی محبت تھی کہ وہ کتابوں کے مطالعے کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ مولانا ایک کتاب کو سات ممالک کی دولت سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔

ایک جگہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

"اسے مبالغہ نہ سمجھئے شاید پہلی بھی کہیں کہہ آیا ہوں کہ کتابوں سے ایک نسبت تعبدی قائم ہوگئی تھی۔ بس چلتا تو انھیں کلیجہ سے لگاتا، چومتا، چاٹتا، ان کی پوجا کرتا!" (آپ بیتی، ص:134)

ایک اہم بات یہ کہ مولانا دریابادی نے باضابطہ سرکاری ملازمت نہیں کی، اسسٹنٹ پروفیسری، ریلوے، پوسٹ آفس ہر جگہ کوشش کی، مگر نوکری تقدیر میں نہ لکھی تھی، نہ ملی۔ ایک دو جگہ اچھے مشاہرے پر نوکری بھی ملی، مگر انھوں نے استعفیٰ دے دیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی تحریر و تالیف اور تبصرہ و ترجمہ نگاری کے سہارے ایک خوش حال اور بھری پری زندگی بسر کی۔ تصنیف و تالیف سے ہی وہ اتنا کسب کر لیتے تھے جو ان کی خانگی زندگی کے لیے کافی ہوتا تھا۔ انھیں تصنیفی پنشن بھی ملا، جو ہر ماہ گھر پہنچتا رہا، حکومت ہند نے انھیں فاضل عربی کی سند سے نوازا، جس میں ایک بڑی رقم سالانہ عطیہ بھی ملتا تھا۔ اس کے بعد اخبارات سے بھی ایک معقول آمدنی ہونے لگی۔ ان کے اخبار صدق کے ساتھ جو چھوٹی سی بک ایجنسی تھی، اس سے بھی آمدنی کی شکل نکلی اور ہر طرف سے بے نیاز ہو کر قلم کتاب سے تاعمر رشتہ برقرار رکھا، گویا وہ علامہ شبلی کی طرح کل وقتی قلم کار بن کر رہے اور باضابطہ ملازمت نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی قلمی صلاحیت کے بل پر اچھی خاصی دولت کمائی اور شہرت و ناموری کا تو پوچھنا کیا۔ انھوں نے لمبی عمر پائی، کوئی چھیاسی سال کی، مگر اپنے وقت کے ایک ایک منٹ کی قدر کی، کسی سے ملاقات بھی کرتے تو گھڑی دیکھ کر اور جتنا وقت ملاقات میں صرف ہوتا، اسی اعتبار سے اپنے مقررہ تالیفی کام کاج میں اضافہ کر لیتے تھے۔ یہ تھا وقت کا خیال۔

یہی وقت کی پابندی تھی کہ آج ان کا تصنیفی سرمایہ ہزاروں صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے مذہب، ادب، سماج، فلسفہ، تاریخ، منطق، نفسیات ہر موضوع پر کتابوں کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ یہ سب اس لیے ہو سکا کہ انھوں نے اپنے وقت کی قدر کی اور خالق کائنات کی طرف سے ملنے والی عمر کے کسی بھی لمحے کو ضائع نہیں کیا۔ اگر آپ بھی ان کی طرح اپنے بچپن کے مرحلے کو اسی طرح کام میں لائیں گے تو آگے چل کر بڑے مصنف و مؤلف بنیں گے اور ملک و قوم کا نام روشن کریں گے۔ مولانا دریابادی نے اتنا بڑا علمی اور ادبی ذخیرہ چھوڑنے کے باوجود اپنے بچپن کے عرصے کو یاد کرتے ہوئے کئی بار یہ مصرع "دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن" دہرایا ہے۔ شاید اتنا کچھ کرنے کے باوجود انھیں کسی چیز کی کمی کا احساس تھا، ہمیں بھی بچپن کے اس مرحلے میں ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ جوانی اور بڑھاپے میں پچھتانا نہ پڑے۔

■

Abrar Ahmad
At+Post Sakri
Distt.: Madhubani - 847239 (Bihar)

ابواللیث جاوید

گاؤں اور ریل

میرے گاؤں میں آئی ریل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

بات ہے میرے بچپن کی   شاید اُنیس سو پچپن کی
میرے دل کی اُلجھن کی   گاؤں میں کیسے آئی ریل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

میرے دادا کہتے تھے   کلکتہ جو رہتے تھے
گاؤں والے ہنستے تھے   وہاں سڑک پر چلتی ریل[1]
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

کلکتہ جانا تھا مشکل   ریل تو ملتی چل کر پیدل
تیس میل پر تھا جو سگنل   مشکل کو سب جاتے جھیل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

بڑے لوگ جب جانا سوچتے   رات میں بیل گاڑی کو جوتتے
راستے میں جب ڈاکو روکتے   چھوڑ کے گاڑی بھاگتے بیل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

آزادی نے داو مٹایا   گاؤں کو شہروں سے ملایا
اُمیدوں کا پھول کھلایا   سدا ہری رہے یہ بیل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

دلّی میں ان شن ہوئے   ریل کے تب نقشے بنے
بابو جی[2] جب بن گئے   مرکز میں وزیر ریل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

شہر سے سب کچھ ریل سے لاتے   ڈبوں کو نقصان پہنچاتے
چوری کرتے پکڑے جاتے   جو پکڑائے جاتے جیل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

مشکل دن سب کٹ جاتے ہیں   لیکن وہ دن یاد آتے ہیں
اب تو سب کالج جاتے ہیں   پکڑ کے پیسے میل
بچو! نہیں یہ کوئی کھیل

---

1 ٹرام وے   2 شری جگ جیون رام

Abul Lais Javed
Maulana Azad Road
Chandwara
Muzaffarpur - 842001 (Bihar)

حوصلوں کی اڑان

ہمتوں کا جہاں باقی رکھ
حوصلوں کی اڑان باقی رکھ
کام دشوار ہے تو کیا پروا
راہ پُرخار ہے تو کیا پروا
غار گہرے بھی ہوں تو پٹ جائیں
حوصلوں سے پہاڑ کٹ جائیں
حوصلے جب اڑان بھرتے ہیں
چاند پر جاکے وہ ٹھہرتے ہیں
جوش اور ولولے ہیں جن کے غلام
ان کو آتے ہیں منزلوں کے سلام
زور طوفاں کا توڑتے ہیں وہی
وقت کے رُخ کو موڑتے ہیں وہی
ان کی ہمت کو جب لگیں کوڑے
وہ سمندر میں ڈال دیں گھوڑے
ٹھوکریں کھاکے مسکراتے ہیں
مشکلوں کو گلے لگاتے ہیں
کوئی غم ہو وہ جھیل سکتے ہیں
اپنے سر سے بھی کھیل سکتے ہیں
ہمتوں کی جوانیاں زندہ
حوصلوں کی کہانیاں زندہ
جی ترا چھوٹنے نہ پائے کبھی
حوصلہ ٹوٹنے نہ پائے کبھی
ہمتوں کا جہاں باقی رکھ
حوصلوں کی اڑان باقی رکھ

Zafar Kamali
Ismail Shaheed (M.M. Colony)
Mill Road
Siwan - 841226 (Bihar)

جاوید دانش

ڈزنی لینڈ میں ایک دن

والٹ ڈزنی تقریباً 20 سال تک ایک خواب دیکھتا رہا۔ وہ آنے والے کل کی منظر کشی کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی تفریح گاہ جہاں لوگ اپنی روز مرہ کی الجھنوں کو بھول کر خوابوں کی بستی میں کھو جائیں۔ لوگوں نے اسے باتونی اور بے وقوف سمجھا مگر 17 جولائی 1955 کی ایک روشن صبح والٹ ڈزنی نے اپنے خواب کی تعبیر پالی۔ اپنی بیٹیوں کے لیے ایک پارک اور فیملی تفریح گاہ سے شروع ہونے والے اس کے خواب نے ایک عالمی تفریح کا سامان مہیا کر دیا تھا۔

اس Showman of the World کو پتہ تھا کہ وہ اپنی کوششوں سے ڈزنی لینڈ کو Magic Kingdom جادو کی سلطنت اور دنیا کی سب سے پر سکون اور پر مسرت جگہ بنا دے گا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

”ڈزنی لینڈ ان خوابوں، خیالوں اور کاوشوں اور نمونہ کمال کے نام منسوب ہے جس سے امریکہ وجود میں آیا۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ ساری دنیا کو خوشی اور تفریح کا سامان اور امن و آشتی کا پیغام دیتا رہے گا۔“

ڈزنی لینڈ عالمی مسرتوں کا گہوارہ اور خواب اور اس کی تعبیر کی زندہ مثال ہے۔ اب تک دو سو چالیس ملین ہر عمر اور ہر دیس کے بچے اس جادو نگری میں آ چکے ہیں۔ جن میں بادشاہ، ملکائیں، شہزادے و شہزادیاں، وزیر اعظم اور صدر پچھلے تیس سالوں سے ایک عمر کی خوشیاں بٹور کر واپس ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک سو اسی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے اس پرستان پر افتتاح کے وقت 17 لاکھ ڈالر خرچ ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈزنی لینڈ کبھی مکمل نہیں ہوگا۔ وقت اور دنیا کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس تصوراتی بہشت میں۔ 20 ہزار چاق و چوبند کارکن سرگرم عمل ہیں۔ یہاں پریوں کے محلات، گھنے جنگلات جو کئی ہزار رقبے پر اگائے گئے ہیں اور دو سو ایکڑ زمین پر پھیلی مصنوعی جھیلیں، پہاڑ، بحری جہاز، اصلی سب میرین بیڑہ اس کے علاوہ مصنوعی ربڑ اور فائبر کے پرندے، درندے، مچھلیاں، سانپ اور کیا کچھ نہیں ہے۔ اس کے انتظام و اہتمام پر عقل دنگ

رہ جاتی ہے۔

لاس اینجلز کے ڈاؤن ٹاؤن سے کوئی 27 میل دور جنوب مشرق میں 4 نمبر روٹ پر اینا ہیم کے علاقے میں ڈزنی لینڈ آباد ہے۔ میں جب اس جادونگری کے گیٹ پر پہنچا تو صبح کے نو بجا چاہتے تھے مگر کچھ نہیں تو پچاس افراد لائن میں کھڑے تھے۔ ٹکٹ کے کئی کاؤنٹر کھلے تھے پھر بھی بھیڑ بہت تھی۔ خدا خدا کرکے میرا نمبر آیا بارہ ڈالر کا پاسپورٹ / ٹکٹ لے کر میں اس الف لیلوی شہر میں داخل ہوا۔ گو میرے ہاتھ میں ڈزنی گائیڈ بک تھی مگر خوشیوں سے روشن چہروں کو دیکھ کر میں نے گائیڈ بک جیب میں رکھ لی اور خود سے بھٹکنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ٹاؤن اسکوائر کے گیٹ سے داخل ہو کر ہم مین اسٹریٹ یو ایس اے پر آ گئے۔ پاس سے ایک ٹرام گزری جسے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ منظر ایک صدی پہلے کا تھا۔ کچھ فاصلے پر قدیمی دمکل، فائر انجن کہیں آگ بجھانے کے تیار ہو رہا تھا۔ اوروں کی دیکھا دیکھی ہم بھی لپک کر ایک پرانی موٹر پر سوار ہو گئے جس میں میرے بچپن کے ساتھی جیسے مکی ماؤس اور ڈونالڈ ڈک سوار تھے۔ میں ان ساتھیوں کے ساتھ تصویر اتارنے کے لیے مچل اٹھا۔ قریب بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اس شرط پر تصویریں اتاریں کہ بعد میں، میں اس کی تصویر اتاروں۔ کیمرہ کلک ہوا اور ہم سب ہنس پڑے۔ مجھ پر اس جادونگری کا جادو اثر کر چکا تھا۔ یہاں آتے ہی بچے، جوان، بوڑھے سب الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان ساتھیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھے۔ سٹی ہال کے باہر ایک بورڈ پر لکھا تھا:

’’گمشدہ والدین اپنے بچوں کے بارے میں یہاں معلوم کریں۔‘‘

مین اسٹریٹ 1890 سے لے کر 1910 کے امریکہ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں گیس کے اسٹریٹ لیمپ اور اولڈ ڈوبن کاریں اور پتھر کی گلیاں، عہد ماضی کی سنہری یادوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہیں مین اسٹریٹ سینما ہاؤس ہے جہاں مکی ماؤس کی کارٹون فلمیں چل رہی ہیں۔ یہیں سے ڈزنی ریل روڈ پورے ڈزنی لینڈ کا سفر کرتی ہے۔ 1890 کی بھاپ کے انجن والی اس ریل پر ہم اس لیے سوار نہیں ہوئے کہ ایسی ریل اب بھی ہمارے یہاں چل رہی ہے۔ ہاں امریکی بڑے شوق سے اس عجیب وغریب ریل پر سوار ہو رہے تھے۔ ان کے لیے بھاپ کی ریل اس دور میں عہد ماضی کی یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مین اسٹریٹ سے نکل کر ہم Adventure Land کی طرف بڑھے۔ سامنے ایک دیو قامت درخت تھا جس پر کئی منزلہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس انوکھے درخت کو دیکھتے ہی بچپن میں دیکھی ایک فلم Swiss Family Robinson یاد آ گئی۔ جسے جوہان وائس کے ناول کی فلمی تشکیل 1961 میں والٹ ڈزنی نے کی تھی۔ اور ایک سال بعد ڈزنی لینڈ میں اس درخت کو زندگی بخش دی گئی۔ میں کیا کوئی بھی اس درخت کو دیکھ کر اصلی کہے گا۔ اس کے تنے، چھال، ٹہنیوں کا قدرتی خم (جھکاؤ)، درخت کا رنگ، پتوں کی رنگت، لٹکتے ہوئے بیل اور جڑیں سب پر اصلی کا دھوکہ ہوتا ہے مگر یہ اصلی نہیں۔

اس درخت میں چھ ٹن اسٹیل اور 110 کیوبک یارڈ سیمنٹ گارے کا استعمال ہوا ہے۔ تقریباً تین لاکھ نقلی پتیاں بہترین دستکاروں نے پلاسٹک اور وائنل سے تیار کیں۔ 80 فٹ اونچے اس عجوبے کا وزن ۵۰ ٹن ہے۔ اس شجری آشیانے کی چوٹی پر لکڑی کی بنی سیڑھی سے ہم بھی خراماں خراماں پہنچے۔ اس درخت کے نیچے کوئیں کی پھرکی لگی تھی۔ پانی کو اوپر لے جانے کے لیے لکڑی کے ڈول استعمال کیے گئے تھے۔ پرانے طرز کے اس مکان میں ضرورت زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔ خواب گاہ، بستر، باورچی خانہ، شراب کی پرانی بوتلیں، لکھنے پڑھنے کی میز، لالٹین، اس کی چوٹی سے پورا ڈزنی لینڈ نظر آ رہا تھا۔

ڈزنی لینڈ پارک میں سات خاص تفریحی علاقے یا سیکشن بنے ہیں۔ مین اسٹریٹ، ایڈونچر لینڈ، نیو اورلین اسکوائر، بیئر کنٹری، فرنٹیئر لینڈ، فنتاسی لینڈ، ٹومارو لینڈ انھیں علاقوں میں ڈزنی کی پوری دنیا آباد ہے۔ ساتھ ہی بے شمار ریستوراں، گفٹ شاپ، اسٹوڈیو، سینما ہاؤس، میوزیم، بازار بینک، لاکرز، معذور سیاحوں اور بچوں کے لیے ویل چیئر رینٹل اور ایک فرسٹ ایڈ کارنر موجود ہے۔

ہم نے پھولوں کو مسکراتے اور بلبلوں اور کوئلوں کو گاتے صرف کتابوں میں پڑھا تھا مگر ٹکی روم کے پھولوں اور پرندوں کو جھومتے، قہقہہ لگاتے اور باضابطہ کورس گیت گاتے دیکھا۔

1963 میں والٹ ڈزنی کے تخیل Audio Animatronics اور کمپیوٹر کی مدد سے اس سحر انگیز ٹکی روم کا آغاز کیا گیا جس میں 250 قسموں کے پھول اور خوش الحان پرندے ہیں۔

ٹکی روم میں مجھ سمیت کوئی 70 افراد موجود تھے۔ ایک اعلان کے ساتھ شو شروع ہوا۔ روشنی دھیمی کر دی گئی۔ جب ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تو سارے پرندے خاموش تھے مگر اعلان کے ساتھ ایک خوش شکل محترمہ ہاتھ میں ایک چھڑی لیے داخل ہوئیں۔ سبھوں کو خوش آمدید یعنی ہائے کہا اور ایک اشارے پر پرندوں نے تیز موسیقی پر اپنا آموختہ دہرانا شروع کر دیا۔ اس کورس میں برازیل کے کچھ پہاڑی طوطے اونچی

آواز میں آلاپ لگاتے تو چند چھوٹے پرندے نیچی سروں میں آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ گانے کے دوران پرندے ایک دوسرے سے مذاق بھی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ پھول جھوم جھوم کر ان کے ساتھ گانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لائٹ اینڈ ساؤنڈ کے اس عجوبے کو لوگ سانس روکے دیکھ اور سن رہے تھے جنگل کی اس حسین شام، ہر برادری کے پرندے اور پھول پودے اپنی خوشی، کورس اور جماعت سے ہمیں یہ سبق دے رہے تھے کہ انسانو! اب بھی اپنے اختلافات ختم کر کے ایک ہو جاؤ اور ہماری طرح ہنستے گاتے زندگی گزارو۔

کمپیوٹر کا کمال تھا کہ اس نے تکی روم میں آواز، روشنی اور موسیقی کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اس رنگ و رامش کے کمرے نے ثابت کر دیا تھا کہ انسانی تخیل جو کچھ سوچ سکتا ہے اس کی تخلیق بھی ناممکن نہیں۔

تکی روم کے احاطے میں ریڈ انڈین شکلیں اور نقاب اور تیر کمان بکے تھے اور ایک اسٹال پر ہوائی کے اناس بک رہے تھے۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ میں نے ایک ڈالر کا جوس لیا اور تکی روم کے پھولوں اور پرندوں کے بارے میں سوچا کیے!

ایڈونچر لینڈ میں سب سے قابل دید جنگل کروز ہے۔ ہم ایک موٹر لانچ کے ذریعہ دنیا کے خطرناک جنگلات والے بحری سفر پر نکلے۔ میرے ساتھ تیس افراد تھے۔ ساتھ ہی ایک رائفل بردار گائیڈ بھی تھا جو اس سفاری لانچ میں آنے والے خطرات سے ہمیں آگاہ کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہم گھنے جنگلات سے گزر رہے تھے جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی اور ماحول بڑا پراسرار تھا۔ مسلسل بارش کی جھنکار میں گائیڈ کی آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم لوگ افریقہ کے جنگلات سے گزر رہے تھے۔ اچانک گائیڈ نے سبھوں کو ہشیار کیا اور فائر ہوا۔ پیچھے سے ایک مگرمچھ منہ پھاڑے حملہ آور ہوا چاہتا تھا کہ گائیڈ نے اسے نشانہ بنالیا تھا۔ اب ہر کوئی خوف زدہ ہو کر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا، بارش اور ہریری نے مل جل کر ایک عجیب ماحول پیدا کر دیا تھا۔ سامنے ہاتھیوں کا ایک شریر جوڑا ایک دوسرے پر پانی کے فوارے اچھال رہا تھا۔ یہاں سندربن اور کانگو کے ہاتھی ساتھ رہتے ہیں۔ اچانک قریب ہی کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ دیکھا ایک اژدہا درخت پر چڑھ رہا تھا اور ایک جنگلی بیل اسے دیکھ کر پھنکار رہا تھا۔ دوسرے کنارے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں ایک چیتا پہلو بدل رہا تھا اور ایک ہرن پر جھپٹنا چاہتا تھا، کچھ دور بارہ سنگھوں کا ریوڑ چوکڑی بھرتا گزر رہا تھا۔ ایک زرافہ اپنی مادہ کو لیے پتہ نہیں کس خوف سے دم سادھے ایک جانب دیکھ رہا تھا۔

اب ہم کھلے آسمان کے نیچے آگئے تھے۔ فضا صاف اور دھوپ کی روشنی میں اب جنگل کی خوبصورتی اچھی لگ رہی تھی۔ دور ایک پہاڑی کے دامن میں جنگل کا بادشاہ اپنے خاندان کے ساتھ دعوت خاص میں مشغول تھا۔ بیچارہ زیبرا اب تک تڑپ رہا تھا۔ شیرنی اس کی گردن سے خون چوس رہی تھی۔ جھاڑی کی اوٹ سے گیدڑ اپنے حصے کا انتظار کر رہا تھا۔ درختوں پر بندروں نے اچھل پھاند لگا رکھی تھی۔ ایک بدمست گینڈا ایک درخت کے نیچے کھڑا پھنکار رہا تھا۔ چند شکاری اپنی جان بچاتے درخت پر چڑھے تھے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ہم اصلی نہیں بلکہ نقلی ایمزان اور جنگلات کے درندوں سے خوفزدہ نہیں تھے۔ گو ہمیں علم تھا کہ سارے درندے میکانیکل تھے اور کمپیوٹر کے حکم سے دم ہلا رہے تھے، آنکھیں جھپکا رہے تھے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہو رہے تھے مگر ماحول کچھ ایسا تھا کہ سب حقیقی لگ رہے تھے۔

ہاں ان جنگلات کو اگانے اور بڑھانے میں کافی وقت لگا تھا۔ ساتھ ہی پانی اور خشکی کے جانوروں کی دیکھ بھال میں چڑیا خانے کے اصلی جانوروں سے زیادہ خرچ اور مشکلات کا سامنا تھا۔ ہم دوسرے ہم سفروں کے ساتھ خیریت سے اس بحری سفر سے واپس لوٹے۔

دوپہر ہو چکی تھی اور ابھی کتنی کی چیزیں دیکھی تھیں۔ ابھی تسخیر کے لیے ایک دنیا پڑی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ قریب ہی تاہیٹی ٹیرس ریستوران میں پولی نیشین ڈشیں پک رہی تھیں جو میرے مطلب کی نہیں تھیں۔ اسٹیک کے نام پر کچا گوشت کھانے کے بجائے میں نے گرین سلاد لیا اور سن کسٹ کی ٹھنڈی بوتل سے ہرے پتوں کو حلق سے اتارا۔

اسکول کے زمانے میں، ہمارے محلے میں مداری والے ریچھ لے کر آتے تھے اور ہم بڑے شوق سے ریچھ کو ڈگڈگی کی تھاپ پر ناچتے تھرکتے دیکھا کرتے تھے۔ والٹ ڈزنی نے ضرور یہ تماشہ کسی انڈین ڈاکومنٹری میں دیکھا ہوگا۔ بس 1972 میں جمبوری کنٹری بیئر کی بنیاد ڈالی۔ ریچھوں کے کرداروں کو بنایا۔ فریڈ، زیب اور ٹیڈ زیکی گومر، ٹیننیسی اور ٹیڈی بیئر وغیرہ منجھے ہوئے نوٹنکی والوں کی طرح اسٹیج پر نہ صرف ناچتے گاتے ہیں بلکہ پورے انہماک سے پیانو، ماؤتھ آرگن، ڈرم ساتھ ہی ڈش پین اور واش بورڈ بجاتے ہیں۔ 18 ریچھوں کی ٹولی اپنے فن اور موسیقی سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں جسے ہر عمر کے بچے، جیسے ہم اور آپ نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ سیٹی بجا کر تالیاں پیٹ کر ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں اور شریر و معصوم ریچھ جھک جھک کر آداب کرتے ہیں۔

نیو اور لین اسکوائر میں بھوت بنگلہ کے صدر دروازے پر ایک نوٹس لگا تھا کہ "تمام بھوتوں اور بدروحوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ بنگلہ کرائے پر دستیاب ہے۔ بے چین روحوں کو کھلی اجازت ہے کہ آس پاس والوں کو جس طرح اور جیسے چاہیں

پریشان کریں۔"

نہ مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا ہے نہ ہی میں ان پر یقین رکھتا ہوں۔ اس لیے میں نے اس دلچسپ بنگلے کی سیر نہیں کی۔ یہ ہماری دیسی فلموں کا بہت گھسا پٹا مسالہ تھا۔

میں نے Pirates of Caribbean کریبین کے قزاق کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ اس کے گیٹ پر بھی لوگوں کی لمبی لائن کھڑی تھی۔ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ایک اندھیرے غار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک دریا غار سے بہتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔ نمبر آتے ہی ہم بھی چھ افراد کی ایک کشتی میں بیٹھ گئے۔ اندر خاصا اندھیرا تھا اور دور دور مشعل روشن تھی۔ کشتیاں ابھی کچھ ہی دور بڑھی تھیں کہ تیز بہاؤ والے آبشار کے ریلے میں آ گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم بڑی بلندی سے نیچے کی طرف گر رہے ہیں اور کشتی اب الٹی، اور سب ڈوبے۔ ایک شور برپا تھا۔ عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے مگر تیزی سے ہم ایک ہموار سطح پر آ گئے۔ سب نے ایک دوسرے کو صحیح سلامت دیکھا تو ہنسنے لگے دراصل کشتیاں لوہے کی پٹریوں پر چل رہی تھیں جو پانی کے نیچے لگی تھیں اور ڈھلان پر یہ کشتیاں پٹریوں سے گزری تھیں۔

اب ہم کھلے آسمان کے نیچے قزاقوں کی بستی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ کنارے ایک انگریز بوڑھا ملاح پائپ پی رہا تھا۔ کنارے پر قدیم محلات اور ٹوٹے ہوئے قلعے نظر آ رہے تھے۔ ماحول اٹھارہویں صدی کے بحری سفر اور ان کے مسائل کا تھا جب بحری قزاق سپینش مین میں قیامت ڈھا رہے تھے۔

ہم ایک لکڑی کے پل کے نیچے سے گزر رہے تھے جس پر دو ڈاکو آپس میں لڑ رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر آگ لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے قزاقوں کی ٹولی یہاں لوٹ مار کر کے گئی ہے۔ ہر سو چیخ و پکار مچی تھی۔

ہم آگے بڑھے۔ قزاقوں نے یہاں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت تھے۔ کچھ دوشیزائیں سہمی سہمی تھیں۔ ایک ڈاکو پہرہ دے رہا تھا۔ انہوں نے کچھ جوانوں کو قید بھی کر رکھا تھا۔ صندوقوں میں بھرے زیور، ہیرے جواہرات، سونا چاندی انہوں نے پتہ نہیں کس کس جہاز سے لوٹا تھا اور کتنوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ 1967 میں قزاقوں کا یہ مسکن اپنی مثال آپ ہے۔

قزاقوں سے بچ کر ہم ایک بار پھر امریکہ کے دریاؤں سے ہوتے ہوئے دنیا کی سیر کو نکل پڑے۔ فرنٹیئر لینڈ کے ساحل پر لگا ہوا کولمبیا جہاز اس بحری جہاز کی ہو بہو نقل ہے جو 1787-1790 میں امریکہ سے دنیا کا چکر لگانے کے لیے نکلا تھا۔ کولمبیا 14 جون 1958 میں ڈزنی لینڈ کے دریا میں اتارا گیا۔ ہم نے جہاز کی تیسری منزل پر ایک کنارے پناہ لی اور ڈزنی لینڈ کی تصویر اتارتے رہے۔ جن جنگلات سے کولمبیا گزر رہا تھا وہاں ریڈ انڈین قبائیلوں کا بسیرا تھا۔ ہم نے اس قبیلے کے لوگوں کو گھوڑے پر سوار شکار کرتے بھی دیکھا اور گھر کے آنگن میں عورتوں کو بچے کھلاتے دیکھا۔ کچھ جوان چمڑے کی مدد سے گھوڑے کی زین بنا رہے تھے تو کچھ تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ ان کے مویشی اور گھوڑے درختوں کی اوٹ میں بندھے تھے جو جہاز کی آواز پر چونک کر مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔

کولمبیا سے اترے تو سامنے ایک اور عظیم الشان جہاز مارک ٹوئین کھڑا تھا جو ۱۰۵ فٹ لمبا تھا مگر میں بحری سفر سے تھک چکا تھا۔ اپنی تھکن دور کرنے کے لیے میں گولڈن ہارس شو ریویو میں گھس پڑا۔ قدیم ٹکساس کی روایت کو لیے اس رقص و

سرور کے شو نے میری تھکن دور کر دی۔ اس شو نے اب تک 43000 پروگرام مکمل کر لیے ہیں اور Guiness Book of World Record میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔

ڈزنی لینڈ میں آیندہ کل، آج نظر کے سامنے ہوتا ہے اور گزشتہ کل دائمی ہو جاتا ہے۔ یہاں ماضی لافانی ہے۔ مگر ان تکنیک اور کمپیوٹر کے غلاموں کے باوجود والٹ ڈزنی وقت کی رفتار کو اپنے طابع نہ کر سکا۔ تمام خوشیوں کے باوجود ہمیں یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وقت کی آئس کریم گھلتی چلی جا رہی ہے سہ پہر کے چار بج رہے تھے اور:

''تم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے''

یہ تو پتہ تھا کہ ایک دن میں ڈزنی کی جنت گھومنے سے رہے۔ اس کے لیے تو ایک ہفتہ بھی کم ہے۔ اچانک یاد آیا کہ مین اسٹریٹ پر چار بجے مکی ماؤس کا شاہانہ جلوس نکلنے والا ہے۔

بس کشاں کشاں ہم مین اسٹریٹ پہنچے۔ ایک خلقت پہلے سے جمی بیٹھی تھی۔ ہزاروں بچے، مرد، عورتیں، بوڑھے ہر رنگ و نسل کے لوگ امریکہ کی دو صد سالہ پریڈ دیکھنے کے لیے جمع تھے۔

بینڈ کی آواز کے ساتھ ہمارے سامنے سے قد آدم مکی ماؤس، ڈونالڈ ڈک، پلوٹو، گوفی، پی نوچیو، سنیزی، ڈوپی اور ساتھ میں ڈزنی کے لاتعداد کردار گزر رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر تماش بینوں کو سلام کر رہے تھے۔ ہاتھ ملا رہے تھے۔ وہ ملاح بھی اپنی کشتیاں لیے ساتھ تھے جو نئی دنیا کی کھوج میں نکلے تھے۔ انھیں تمام دشواریوں اور آزمائشوں کے بعد ایک ایسی سرزمین مل گئی تھی، جو ان کی منزل مقصود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں امریکہ کا سرخ و سفید دھاریوں اور ستاروں والا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس پریڈ میں امریکہ کی آزادی کی سالگرہ کا کیک بھی شامل تھا۔

ڈزنی لینڈ کا ایک کونا ایسا بھی تھا جہاں ساری دنیا سمٹ آئی تھی۔ دنیا کے چھ براعظموں کی بیشتر قوموں کے بچے، ننھے منے دلکش کھلونوں کے روپ میں دیسی موسیقی پر ایک کورس گا رہے تھے۔ Its a small world۔

شام چھ بجا چاہتے تھے۔ میں تھک کر چور تھا مگر ڈزنی لینڈ سے جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نہ تو ابھی اڑتے ہوئے ڈمبو ہاتھی پر بیٹھے تھے، نہ اسکائی وے میں اڑتے ہوئے ڈزنی کا جائزہ لیا تھا۔ نہ ہی فنتاسی لینڈ کے آٹو پیہ موٹر کار میں بیٹھ کر اپنی مرضی سے گاڑی دوڑائی تھی، نہ ہی سلیپنگ بیوٹی کا محل دیکھا تھا اس کے ساتھ ہی ٹومارو لینڈ کی سب میرین میں بیٹھ کر سمندر کی تہہ کی سیر کرنا تھا۔ اپنیس پہاڑوں کو تسخیر کرنا تھا نہ ہی راکٹ سے مریخ کی سیر کر پائے تھے۔ اتنی چیزوں کو دیکھ کر بھی جتنا دیکھا تھا۔ ایک دن میں ایک عمر کی خوشی بٹوری تھی۔ اتنا ہنسے تھے کہ پوری آوارگی میں نہ ہنسے ہوں گے اور اب تک ہم ہنسے کہاں تھے۔ وہ تو لوگ ہنس رہے تھے ....پتہ نہیں کس پر!!

والٹ ڈزنی 15 دسمبر 1966 کو ڈزنی لینڈ کے تمام کرداروں، کارکنوں اور تصوراتی بہشت کو چھوڑ کر اس دارفانی سے کوچ کر چکا ہے مگر اس کے بنائے ہوئے کردار لافانی ہیں۔ اس نے کہا تھا:

”جب تک انسانی تخیل جوان ہے ڈزنی لینڈ بھی جوان رہے گا۔ یہ کبھی مکمل نہیں ہوگا وقت اور زمانے کے ساتھ اس میں توسیع اور اضافے ہوتے رہیں گے!“

■

Mr. Jawaid Danish
Artistic Director, Rang Manch - Canada
Director, Panorama India

■ زبیر رضوی

• زبیر رضوی کی یہ نظم غیر مطبوعہ ہے۔ انھوں نے اپنی وفات سے کچھ دنوں قبل یہ نظم تحریر کی تھی۔ یہ نظم ہمیں ان کی اہلیہ محترمہ جمشید جہاں نے عنایت کی۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ (ادارہ)

اردو زباں ہماری

اردو زباں ہماری
پھولوں کی جیسی کیاری
پھل دار جیسے ڈالی
تازہ ہوا کی جالی

اردو زباں ہماری

لفظاں کی لوریوں میں
دادی کی بولیوں میں
شہروں میں بستیوں میں
ہونٹوں پہ اور دلوں میں

اردو زباں ہماری

مندر میں مسجدوں میں
آباد آنگنوں میں
بوندوں میں بادلوں میں

اردو زباں ہماری

گنگا کے ساحلوں سی
جمنا کے پانیوں سی
گاؤں کی دھڑکنوں میں
شہروں کی رونقوں میں

اردو زباں ہماری
پھولوں کی جیسی کیاری

ملک بزمی

چاند اور بندر

"**دادا جان**، آج ہمیں کوئی اچھی سی کہانی سنائیے۔" صفی اور شگوفہ نے آخر کار آج دادا جان کو گھیرا۔ ابھی دادا جان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ بشریٰ اور صدف نے بھی اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "نانا جان، کہانی اچھی بھی ہو اور نئی بھی" دادا جان، دادا جان۔ نانا جان، نانا جان۔ کہانی کہانی، سب بچے تالیاں بجا کر شور مچانے لگے۔

"اچھا بھائی اچھا۔ کہانی سنائیں گے اور ضرور اچھی کہانی سنائیں گے، لیکن آپ لوگوں کو خاموشی سے اور غور سے سننا ہوگا—"

"ہزاروں برس پرانی بات ہے، جب خوب امن و امان تھا۔ کیا شہر، کیا گاؤں، کیا جنگل۔ ہر طرف سکون اور ہریالی تھی۔ جنگل میں تمام خونخوار جانور بھی آپس میں میل محبت سے رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارا چاند بھی اسی جنگل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ شیر ہو یا ہاتھی، بندر ہو یا ریچھ، خرگوش ہو یا ہرن۔ چاند ہر ایک کا دوست تھا اور سبھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ بہت شریر تھا اور ہنس مکھ بھی لیکن تب وہ اتنا خوبصورت اور چمکیلا نہیں تھا۔ اسی وقت مارکٹ میں گورا ہونے کی ایک کریم آئی تھی اور اس کی تشہیر زوروں سے ہو رہی تھی کہ اس کے استعمال سے رنگ بھی نکھرتا ہے اور جلد بھی نرم اور چکنی ہو جاتی ہے۔ دوسروں کی بہ نسبت چاند کے پاس اچھی خاصی رقم بھی تھی۔ اس لیے اس نے بازار جا کر کریم کی بہت ساری شیشیاں خریدیں اور رات بھر اپنے سارے جسم اور چہرے پر اس کی مالش کرتا رہا۔ بہت مزہ آ رہا تھا اور اس نے ایسا محسوس کیا کہ واقعی کمپنی نے جیسا وعدہ کیا وہ حرف بہ حرف درست تھا۔ اس کریم کو لگانے کے بعد چاند ایسا جگمگانے لگا تھا کہ بس!"

"مگر دادا جان اس زمانے میں ریڈیو تھا نہ ٹی وی۔ پھر تشہیر کس طرح ہو سکتی ہے" شگوفہ نے شگوفہ چھوڑا۔ صدف کہاں چپ رہنے والی تھی۔ وہ بھی شروع ہو گئی۔ "نانا جان ہم نے اچھی کہانی سنانے کی فرمائش کی تھی لیکن آپ تو صرف پھینک رہے ہیں۔" صفی اور بشریٰ بھی اپنے پیارے دادا جان اور نانا جان پر لد سے گئے۔ خان صاحب نے ان سب کو پیار کیا۔ سمجھایا کہ "دیکھو بچو کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں اگر تم ضد کرو گے، اور شور مچاؤ گے تو ہم کہانی نہیں سنائیں گے۔" اس دھمکی کے بعد مہوش کو ہوش آیا۔ بڑی تھی اس لیے اپنا رول نبھانے لگی۔ اس نے صفی، شگوفہ اور صدف کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور پھر سب کہانی سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ خان صاحب نے پھر کہانی شروع کی۔ کہا— "دوسرا ہی دن تھا کہ چاند اپنے

دوستوں کے ساتھ کھیلنے جنگل پہنچا تو ہر کوئی اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کیسی آب تاب تھی۔ کیسا چمک رہا تھا وہ۔۔ ہرن۔ ہاتھی، شیر، چیتے اور خرگوش اسے دیکھتے رہے۔ حیرت سے دیکھنے والوں میں بندر بھی تھا۔ بندر نے سوچا چاند سے اکیلے میں، تنہائی میں اس خوبصورتی کا راز ضرور پوچھنا چاہیے۔ جب سب چرند اور پرند۔ ہاتھی، شیر، خرگوش، مور وغیرہ چلے گئے تو بندر نے چاند سے پوچھا۔ ''چاند بھائی۔ آج تو آپ خوب چمک رہے ہو۔ آخر ایسا کیا جادو آپ نے کر دیا؟'' بچو ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ چاند جتنا معصوم اور بھولا بھالا نظر آتا تھا ویسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو بڑا شرارتی تھا۔ اس نے بڑی معصومیت اور سنجیدگی سے بندر کو بتلایا۔ ''بھائی بندر۔ تم نے کیا ان دنوں ریڈیو اور TV پر ایڈورٹائز نہیں سنا، نہیں دیکھا۔ جس پر رات دن بتایا جا رہا ہے کہ ایک خاص کاجل لگانے سے رنگ روپ نکھرتا ہے اور خوبصورتی میں اپنے مقابل کوئی نہیں رہتا۔ بندر کے پوچھنے پر چاند نے بتایا کہ شہر کی بہت ساری دکانوں پر اس خاص کاجل کی ڈبیاں ملتی ہیں۔ انھیں اپنے چہرے پر بہت اچھی طرح لگانا چاہیے۔'' بندر نے سوچا چلو اچھا ہوا جو میں نے اکیلے میں چاند سے خوبصورتی کا راز پوچھا اگر اور کوئی سن لیتا تو وہ بھی اس کاجل کو خرید لیتا۔ میں اب بازار جا کر دکانوں سے اس خاص کاجل کی ساری ڈبیاں خرید لوں گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بازار جا کر کاجل کی ڈبیاں خرید لیں۔ رات بھر ساری ڈبیاں اپنے چہرے پر ملتا رہا۔ دن بھر کی محنت اور ساری رات کی جگائی سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور سہانے سپنے دیکھتے دیکھتے وہ سو گیا۔

دوسری صبح وہ جنگل پہنچا اور ندی کنارے پانی پینے وہ جھکا تو اپنی کالی کلوٹی صورت دیکھ کر گھبرا گیا۔ پریشان ہو گیا کہ یہ کون ذات شریف ہے؟ تب ہی ننھے خرگوش نے اسے دیکھا اور خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔ ہرن نے بھی دیکھا اور ہمت کر کے پوچھا ''بندر بھائی یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا کھانے پینے میں کوئی زہریلی چیز آ گئی تھی کہ سارا منہ کالا اور بدصورت ہو گیا ہے۔ بندر ہکا بکا ہر ایک کی صورت دیکھنے لگا جو حیرت اور افسوس سے بندر کو دیکھ رہے تھے۔ تب بندر نے سب کے سامنے اپنی بپتا سنائی کہ ''کل چاند نے کہا تھا ایک خاص کاجل لگانے سے چہرے پر چمک اور خوبصورتی آتی ہے۔ اس لیے میں نے وہ خاص کاجل اپنے چہرے پر خوب ملا۔'' بندر کی بات سن کر خرگوش بولا ''بندر بھیا۔ چاند نے آپ کے ساتھ خوب دھوکا کیا ہے کاجل کالا ہوتا ہے اور اسے سارے چہرے پر نہیں صرف آنکھوں میں لگایا جاتا ہے۔ بدن پر اور چہرے پر تو بس کریم لگایا جاتا ہے جو میاں چاند نے خود استعمال کی ہے۔ یہ سن کر بندر کو خوب غصہ آیا۔ اسی وقت چاند آ پہنچا۔ بندر نے جو چاند کو آتے دیکھا تو لپکا مارنے کے لیے۔ مگر چاند تو چاند تھا۔ بڑا ہوشیار بڑا ذہین۔ اس نے اونچی اونچی چھلانگیں لگائیں اور آسمان پر چڑھ بیٹھا۔ تب سے وہ آسمان کا ہو گیا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ نیچے آنے پر بندر اس کی خبر لے گا۔''

صدف مسکرائی اور کہنے لگی ''تو کیا نانا جان اب چاند زمین پر کبھی نہیں آئے گا۔۔؟'' نانا جان کی بجائے بشریٰ نے جواب دیا ''صدف رانی، بندر سے ڈر کر تو وہ آسمان پر جا بیٹھا ہے۔ اب وہ نیچے زمین پر کیوں آنے لگا۔''

■

Malik Bazmi
Goldy Agency, New Building
Post: Pathri - 431506
Distt.: Parbhani (Maharashtra)

راشد جمال فاروقی

دو کہاوتیں

بچو! آپ نے اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کئی بار محاورے بولے بھی ہوں گے اور سنے بھی ہوں گے۔ محاورے چند الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں جو ہماری گفتگو کو پُر اثر، دلچسپ اور آسان بنا دیتے ہیں۔ جب آپ کا کوئی دوست بہت مدت بعد ملا ہو تو آپ اسے عید کا چاند قرار دیتے ہیں۔ اپنے خاندان میں سب کا پسندیدہ انسان آنکھ کا تارا کہلاتا ہے۔ مشکل کام کو ہم ٹیڑھی کھیر کہتے ہیں۔ ناممکن کام کرنے کی کوشش کو لوہے کے چنے چبانا کہا جاتا ہے۔ محاوروں کی ہی طرح کہاوتیں بھی ہوتی ہیں اور ان کا استعمال بھی ہماری بات کو زیادہ سہل اور دلچسپ بنانے کے کام آتا ہے۔ کہاوتیں دراصل پورا جملہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ سانپ تو نکل گیا اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ آج ہم دو کہاوتوں کے تعلق سے جو کہانیاں رائج ہیں ان کا ذکر کریں گے:

(1) جس کا کام اسی کو ساجے، اور کرے تو ڈنڈا باجے: یہ کہاوت اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کوئی شخص ایسا کام کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جسے وہ جانتا نہیں نتیجتاً کام تو ہوتا نہیں الٹا نقصان متوقع ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دھوبی ایک کتا اور ایک گدھا پالتا تھا۔ ایک روز دریا پر کپڑے دھونے کے بعد جب وہ واپس گھر لوٹ رہا تھا تو تھکا ہوا تو تھا ہی۔ کتے کی کسی غلطی پر اس نے کتے کو سخت سزا دی اسے خوب مارا پیٹا۔ کتا چپ چاپ بغیر کچھ کھائے پیے گھر آ کر سو گیا۔ خالی پیٹ کی وجہ سے اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں دھوبی کے گھر میں ایک چور گھس آیا۔ کتے نے چور کو دیکھ لیا تھا لیکن وہ اپنے مالک سے اس قدر خفا تھا کہ چپ چاپ پڑا رہا۔ چور چوری کرتا رہا۔ گدھے نے جب یہ دیکھا کہ مالک کا سامان چور باندھ رہا ہے اور کتا چپ چاپ پڑا ہے تو وہ زور زور سے ریںکنے لگا تاکہ مالک کی آنکھ کھل جائے۔ گدھے کی چیخ پکار سن کر چور تو نکل بھاگا۔ مالک کی نیند خراب ہو گئی تھی، اسے معلوم نہیں تھا کہ چور اپنا کام کر گیا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور گدھے پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ برا بھلا کہتا رہا کہ بھلا آدھی رات کو یوں شور مچانے کی ضرورت کیا تھی۔ گدھے کو مار پیٹ کر مالک سو گیا۔ کتے نے گردن اٹھائی اور گدھے کو چڑایا ''کیوں کیسی رہی؟ تم میرا کام کرنے چلے تھے نا۔ دیکھ لیا انجام۔ بھیا! جس کا کام اسی کو ساجے اور کرے تو ڈنڈا باجے۔

(2) ایک کہاوت ہے یہ منھ اور مسور کی دال: جب کوئی شخص کسی اعزاز یا رتبے کا اہل نہ ہو تو طنز کرتے ہوئے کہا جاتا ہے۔ یہ منھ اور مسور کی دال۔ روایت ہے کہ لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کا جب زوال ہوا اور ان کا عملہ برطرف کر دیا گیا تو ایک فنکار باورچی روزی کی تلاش میں ایک ہندو رئیس کے یہاں جا پہنچا۔ یہ بتانے پر کہ وہ نواب واجد علی شاہ کے یہاں باورچی تھا، رئیس نے اسے ملازم رکھ لیا۔ لیکن جب رئیس کو یہ معلوم ہوا

کہ باورچی تو صرف مسور کی دال بنانا جانتا ہے تو اسے کچھ اچھا تو نہ لگا لیکن اس نے باورچی کو مسور کی دال بنانے کا حکم دیا۔ دوپہر کو جب دسترخوان بچھا تو رئیس کو اور اس کے تمام دوستوں کو مسور کی دال بے انتہا لذیذ لگی۔ یہ لوگ دسترخوان پر موجود دوسرے لوازمات کو چھوڑ کر صرف مسور کی دال پر ہاتھ صاف کرتے رہے۔ کھانے کے درمیان ہی رئیس نے باورچی سے مسور کی دال کی بہت تعریف کی اور پوچھ بیٹھا ''اس دال پر کتنی لاگت آئی ہے؟'' باورچی نے جواب دیا کہ ایک دھیلے کی دال تھی اس پر نو روپیہ پانچ آنہ لاگت آئی ہے تو رئیس کے منھ میں نوالہ اٹک گیا۔ اس نے حیرت اور شک کے ساتھ باورچی کو دیکھا۔ باورچی جھوٹا تو تھا نہیں۔ شک کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہاں حیرت سے رئیس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ باورچی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا تو تھا نہیں۔ نواب واجد علی شاہ کا ملازم رہ چکا تھا۔ اس سے قبل کہ رئیس کچھ کہتا۔ باورچی نے جیب سے نو روپے پانچ آنے نکالے اور رئیس کے سامنے تقریباً پھینکتا ہوا بولا ''یہ لو اپنے پیسے۔ یہ منھ اور مسور کی دال۔''

تو بچو کیسی لگیں آپ کو یہ کہانیاں۔ آپ بھی خوب محاورے اور کہاوتیں سیکھو، انھیں استعمال کرنا جانو اور اپنی تحریر و تقریر میں چار چاند لگاؤ۔ اگر آپ نے توجہ سے اس مضمون کو پڑھا ہوگا تو دیکھا ہوگا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ہاتھ صاف کرنا، منھ میں نوالہ اٹک جانا، آنکھیں پھٹی رہ جانا اور ایرا غیرا نتھو خیرا وغیرہ کے استعمال سے بات واضح ہو جاتی ہے اور اس میں ایک زور پیدا ہوتا ہے۔ بس یہی کام محاوروں اور کہاوتوں کا ہے۔

■

Rashid Jamal Farooqui
C-1452, IDPL Township
Virbhadra (Rishikesh)
Dehradun - 249202 (UK)

ابن آس محمد

بھوری، نیلی بکریاں

بھوری اور نیلی دو بکریاں تھیں۔

بھوری کی کھال کتھئی تھی جس پر جگہ جگہ سیاہ دھبے بے حد خوب صورت لگتے تھے۔ جبکہ نیلی کا رنگ کالا تھا اور اس کی کھال پر کتھئی دھبے تھے البتہ اس کی آنکھیں بالکل نیلی تھیں۔

وہ دونوں بلند اور ویران پہاڑوں میں رہتی تھیں، جہاں بڑے بڑے درخت اور سبز گھاس اتنی زیادہ تھی کہ وہ ساری زندگی بھی کھاتی رہتیں تو ختم نہ ہوتی۔

یہ کہانی اس وقت کی ہے جب یہ دونوں بکریاں بہت چھوٹی تھیں۔ ان دنوں پہاڑ پر سبز اور بے حد ذائقے دار گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ مگر اب اس بات کو زمانہ گزر گیا۔ اب تو وہاں نہ گھاس ہے اور نہ سبز جھاڑیاں اور یہ سب اُن نادان بکریوں کی وجہ سے ہوا۔ یہ دونوں بکریاں اصل میں بے حد لالچی تھیں، ہر وقت گھاس کھاتی رہتی تھیں۔ اگر وہ عقل مند ہوتیں تو گھاس کے صرف پتے کھاتیں۔ مگر وہ اس قدر لالچی تھیں کہ جب گھاس کھانا شروع کرتیں تو ان کی جڑیں تک چبا ڈالتیں۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت پودوں تک کو نہیں بخشا انھوں نے، جو چیز سامنے آئی چٹ کر گئیں، حتیٰ کہ ایک روز پہاڑ کی ساری گھاس ختم ہوگئی۔

اس روز بھوری بکری نے گھاس کے آخری گچھے کو زمین سے اکھیڑ کر منھ میں چباتے ہوئے نیلی بکری سے کہا۔

''گھاس تو بالکل ختم ہوگئی۔ اب ہم کیا کھائیں گی؟''

نیلی نے ذرا بڑے درختوں کی طرف سر ہلا کر اشارہ کیا اور بولی۔

''یہ درخت جو ہیں۔ ان کے رس دار پتے بڑے مزے دار ہوتے ہیں۔ گھاس ختم ہوگئی تو کیا ہوا، اب ہم یہ کھائیں گے۔''

دوسرے دن سے ہی بھوری نیلی بکری نے درختوں کے پتوں کو بھی کھانا شروع کردیا۔ وہ اچھل کر درختوں پر چڑھ جاتیں، اور جب تک درخت کا ایک ایک پتا نہ کھالیتیں، درخت سے نہ اترتیں۔ آخر ایک دن تمام درختوں کے پتے بھی

ختم ہوگئے۔ وہ اتنی بیوقوف تھیں کہ درختوں کی نئی نئی اور تازہ کونپلوں کو بھی چبا لیتی تھیں۔ جلد ہی سارے درخت ٹنڈ منڈ ہوگئے۔ اب ان پر ایک بھی پتا نہیں بچا تھا اب وہاں صرف ایسے سوکھے پودے رہ گئے تھے جن پر لمبے لمبے کانٹے تھے اور انہیں کھانا بھوری اور نیلی کے لیے مشکل تھا۔

موسم تبدیل ہوا اور گرمیاں آگئیں۔ سورج کی گرمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب درخت اور پودے تو تھے نہیں کہ طوفان کا راستا روکتے یا ان کا زور کم کرتے چناں چہ تیز ہواؤں نے طوفان کی شکل اختیار کرلی اور ریت کے بگولے اڑنے لگے۔

اب وہاں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا، سوائے درختوں کے چند ٹنڈ منڈ تنوں کے۔

بھوری نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''یہاں تو کھانے کو کچھ بھی نہیں بچا اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

نیلی روتے ہوئے بولی۔

''بھوک کے مارے تو میری حالت بھی خراب ہورہی ہے۔''

دونوں اب بہت پریشان تھیں۔

بھوری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم زیادہ عرصہ یہاں رہیں تو کچھ ہی دنوں میں بھوک سے مرجائیں گی۔ کیوں نہ یہاں سے کہیں اور چلیں، کسی ایسی جگہ جہاں ہمارے کھانے کے لیے بہت کچھ ہو...... مثلاً نیچے وادی میں، جہاں میرا خیال ہے ہمارا پیٹ بھرنے کے لئے بہت کچھ موجود ہوگا۔''

نیلی فوراً راضی ہوگئی اور چہک کر بولی۔

''بہت اچھا خیال ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے۔''

دونوں بکریاں یہ فیصلہ کرتے ہی وہاں سے چل دیں۔ پہاڑ سے نیچے آئیں اور وادی میں اتر گئیں، چلتے چلتے وہ ایک بستی میں پہنچیں۔ اس بستی میں ایک چھپرے کے نیچے بہت سارے قالین رکھے ہوئے تھے۔ دونوں بکریاں بہت خوش ہوئیں۔

نیلی نے کہا۔ ''شکر ہے، یہاں پیٹ بھرنے کے لیے بہت اچھی چیز موجود ہے۔''

اور پھر انھوں نے فوراً ہی ایک بہت بڑے قالین کو کھانا شروع کردیا۔ یہ قالین نیلے اور سبز اُون سے بنا ہوا تھا اور اس پر پوری دنیا کا نقشہ نہایت خوب صورتی اور مہارت سے بنایا گیا تھا۔ وہ بہت سارا قالین کھا گئیں۔ بھوری جس حصے کو کھا رہی تھی وہ آسٹریلیا کا نقشہ تھا۔ جبکہ نیلی جس حصے کو چبا کر نگل رہی تھی وہ امریکا کا نقشہ تھا۔ آسٹریلیا کا آخری حصہ کھاتے کھاتے اچانک بھوری نے کہا۔

''یہ قالین تو مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ اگر یہ اڑن قالین ہوتا، تو ہم کسی سرسبز ملک میں چلی جاتیں۔''

وہ دونوں اس وقت قالین کے اوپر کھڑی قالین کھا رہی تھیں۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک قالین زمین سے ذرا بلند ہوا اور ہوا میں تیرنے لگا۔

بھوری نے چلا کر کہا۔

''ارے! یہ کیا ہوا؟ یہ...... یہ تو جادوئی قالین ہے! اوہ، میرے خدا...... ہمیں...... ہمیں اڑنے والا جادوئی قالین مل گیا ہے۔ مجھے تو اپنی قسمت پر یقین نہیں آرہا ہے۔''

نیلی حیرت سے اس کا منھ دیکھنے لگی، بھوری نے پرجوش آواز میں کہا۔

''میں نے اس قالین کے بارے میں اپنی ماں سے بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔ یہ قالین ہمیں دنیا میں کسی بھی جگہ

لے جاسکتا ہے۔''

نیلی نے قالین کو مزید کھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ ہمیں کہاں کہاں لے جاسکتا ہے۔''

بھوری نے قالین کا ایک حصہ کھاتے ہوئے۔''شاید...، یہ جو نقشہ اس پر بنا ہے، جو جو ملک اس میں نظر آرہے ہیں، قالین ہر اس جگہ لے جاسکتا ہے۔''

نیلی بولی''واقعی! اگر یہ سچ مچ جادوئی قالین ہے اور ہمیں اڑا کر ہر اس ملک میں لے جاسکتا ہے جہاں کا نقشہ اس پر بنا ہے تو پھر یہ تو بڑا حیرت انگیز قالین ہوا۔ ارے واہ، ہمارے تو مزے آگئے۔''

اتنی دیر میں وہ قالین کا وہ حصہ کھا چکی تھی جس پر کینیڈا کا نقشہ تھا۔

نیلی نے قالین پر منھ مارتے ہوئے کہا۔''میری ہمیشہ سے خواہش ہے کہ میں کسی طرح امریکا دیکھ لوں۔ اور اب یہ قالین ہمیں امریکا لے کر جائے گا، سنا ہے، وہاں دنیا کی سب سے بڑی بڑی چراگاہیں ہیں، بہت بڑے بڑے جنگل ہیں اور گھاس کے میدان ہیں۔''

بھوری نے تنک کر کہا۔''مگر میں امریکا نہیں آسٹریلیا جانے کی خواہش مند ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے نقشے کی طرف دیکھا اور قالین کا ایک حصہ کھاتے ہوئے بولی۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ یہاں سے امریکا بہت دور ہے۔''

دونوں احمق اور لالچی بکریاں غائب دماغی کے عالم میں باتیں بھی کرتی جارہی تھیں، جانے کے منصوبے بھی بنارہی تھیں اور ساتھ ساتھ قالین بھی ہڑپ کرتی جارہی تھیں اور قالین رفتہ رفتہ چھوٹے سے چھوٹا ہوتا جارہا تھا۔ مگر وہ باتیں کرنے اور قالین کھانے میں اس قدر مگن تھیں کہ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔

''ٹھیک ہے۔'' آخر کار بھوری نے کہا۔ اس کا منھ اب بھی بھرا ہوا تھا اور اس میں قالین کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا جسے وہ

ساتھ ساتھ چباتی بھی جارہی تھی۔

''ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ اس اڑن قالین کے ذریعے آسٹریلیا یا امریکا جانے کے بعد برطانیہ کی سیر بھی کرلیں؟''

''ہاں! یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔'' نیلی فوراً اس کی بات سے متفق ہوگئی۔

''چلو، پھر برطانیہ ہی چلتے ہیں۔'' اس نے قالین کا ایک اور ٹکڑا منھ میں دبا کر کھاتے ہوئے کہا اور اس ٹکڑے کو کھاتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا۔

دونوں نے بہ یک وقت نیچے دیکھا اور سناٹے میں آگئیں۔ کیوں کہ باتوں باتوں میں وہ پورا قالین ہڑپ کر گئی تھیں۔

عین اس وقت میدان کی جانب سے ایک بہت موٹا آدمی ہاتھ میں بڑا سا چھرا لیے، چیختا چلاتا ہوا ان کی طرف لپکتا نظر آیا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔ اس نے وہیں سے چلا کر کہا۔

''اے! بیوقوف اور بھوکی بکریو، ٹھہرو تو ذرا میں تمھارے ٹکڑے کرتا ہوں۔ تم نے میرا قیمتی اڑن قالین کھالیا، ابھی تمھیں سبق سکھاتا ہوں اور تمہاری تکا بوٹی کرتا ہوں۔''

بھوری اور نیلی کے چاروں پائے پھول گئے، وہ سر پر پائے رکھ کر بھاگیں اور انھوں نے اسی پہاڑ پر پہنچ کر دم لیا جہاں کی ساری گھاس وہ پہلے ہی کھا چکی تھیں۔

ان بکریوں کی نسل کی بکریاں اور بکرے اب بھی اس پہاڑ پر رہتے ہیں۔ مگر وہ خوراک کی کمی کی وجہ سے بے حد لاغر اور کمزور ہیں، کیونکہ بھوری اور نیلی نامی قدیم بکریوں نے اس علاقے کی ساری گھاس کھالی تھی۔ اس پہاڑ کی بکریاں، آج بھی اپنے بچوں کو بھوری اور نیلی کی حماقتوں کی کہانی سناتی ہیں۔ اور نصیحت کرتی ہیں کہ زیادہ کھانے کی حرص (لالچ) بے حد خطرناک ہوتی ہے، اس لیے اتنا کھاؤ جتنا کھانا چاہیے اور صرف اس وقت کھاؤ جب بھوک لگے۔ وہ اپنے بچوں کو ایک نظم بھی سناتی ہیں، جو کچھ یوں ہے۔

ایک تھی بھوری، ایک تھی نیلی
کھاتی تھیں وہ خالی پیلی
کہنے کو تھیں گرچہ بکری
بھوک تھی لیکن اتنی وکھری
جو کچھ ان کے سامنے آتا
جبڑوں سے وہ پیٹ میں جاتا
گھانس کے تنکے، درخت کے پتے
لکڑی، پودے، کاغذ، گتے
جو کچھ پایا، سب کو کھایا
کھا کر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا
ہائے رے بکری، ہائے رے بکری
نیلی بکری، بھوری بکری،
تھوڑا کچھ تو چھوڑا ہوتا
مستقبل کا سوچا ہوتا
آج اگر ہے، کل کا سوچو
تھوڑا کھاؤ، تھوڑا رکھو
کھانا کم کم، حکمت ہے۔
زیادہ کھانا، زحمت ہے
کل کا جو بھی سوچ نہ پائے،
احمق بکری، وہ کہلائے۔

■

Ibne Aas Muhammad
Flat No: A/012, First Floor, Billy's Towers
Main Rashid Minhas Road, Gulshan-e-Iqbal
Karachi (Pakistan)

آخری قسط

مکھانے کی کھیر

مصنف: ذکیہ مشہدی

مصور: فجر الدین

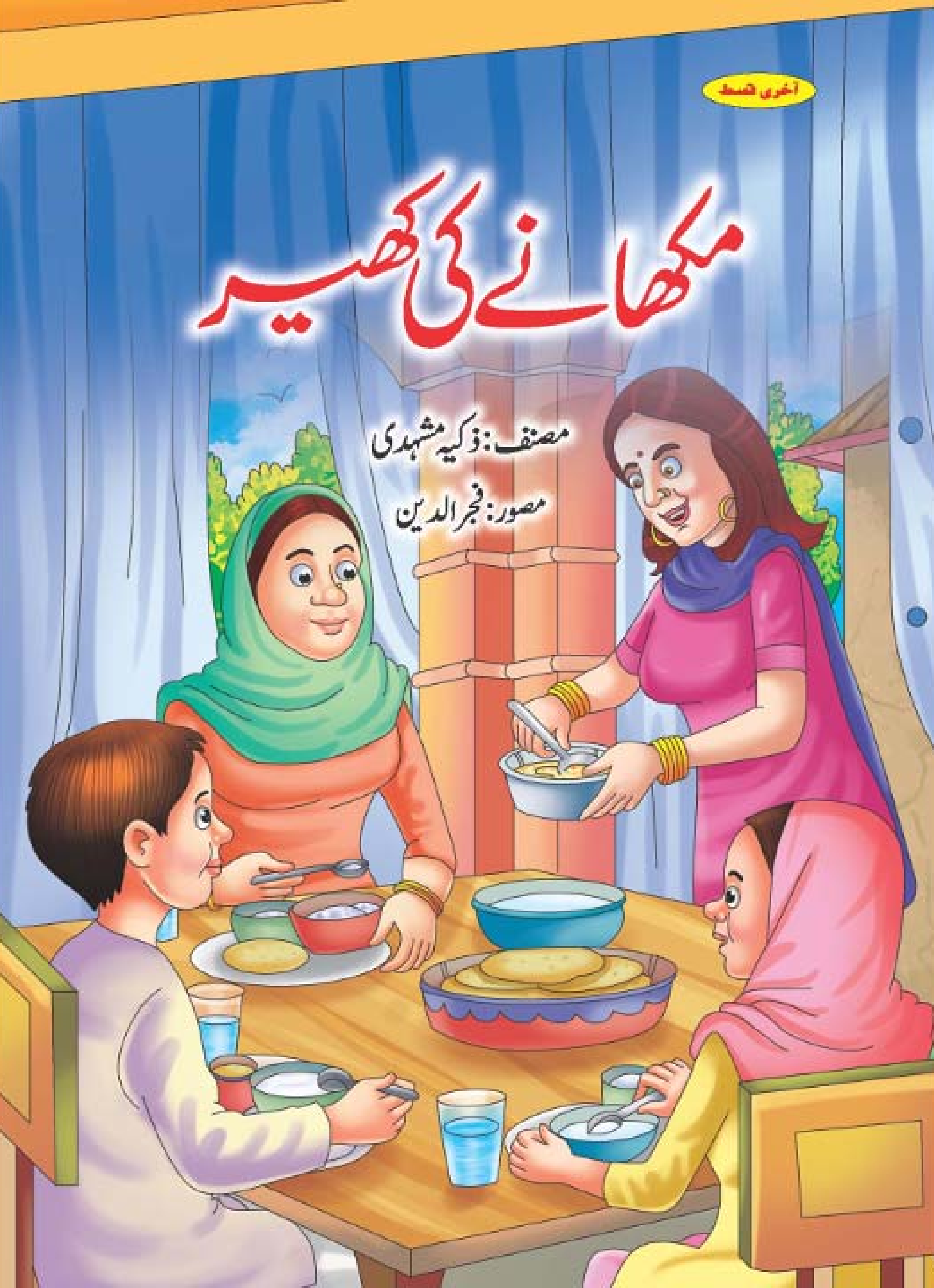

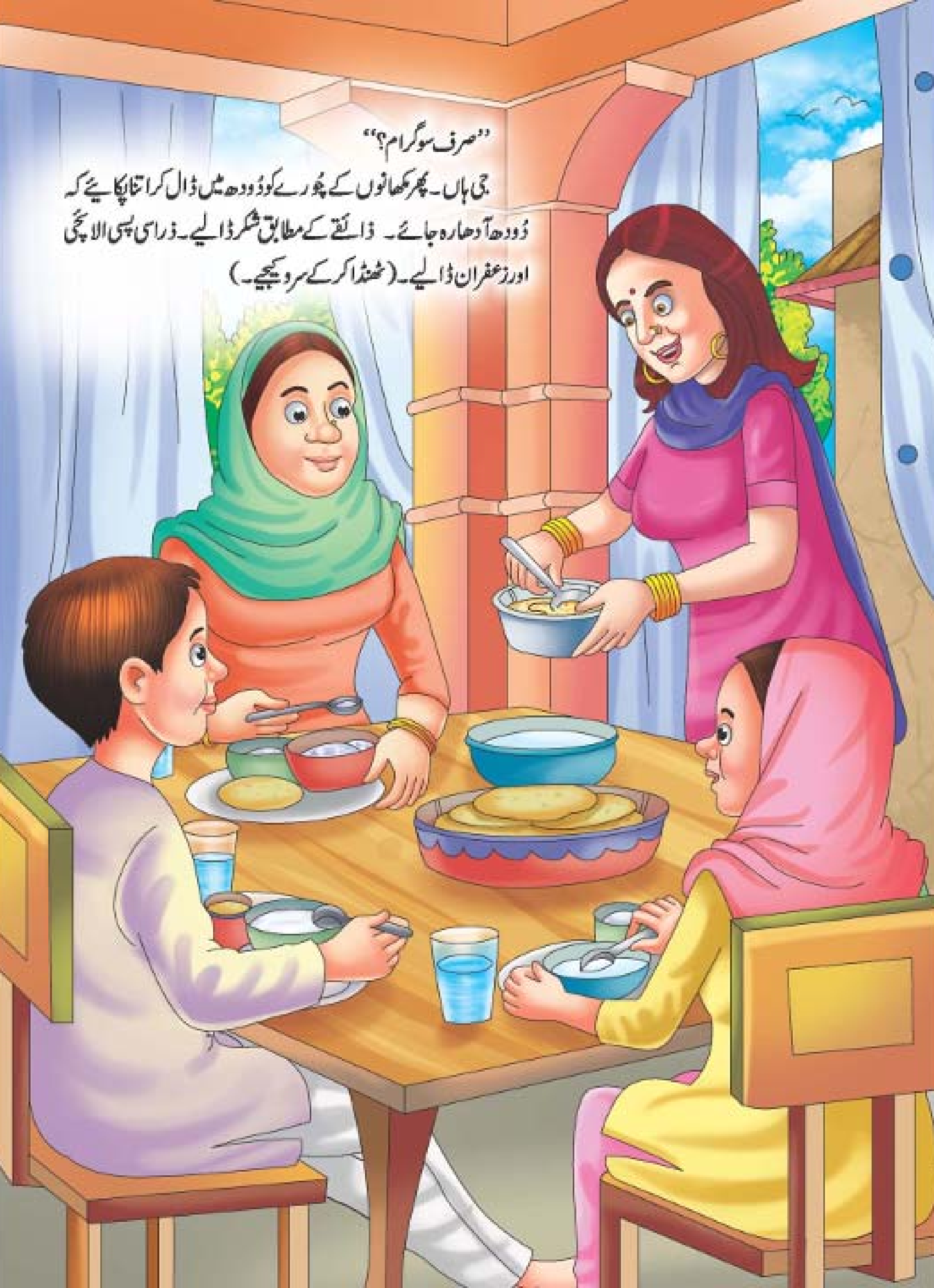
''صرف سو گرام؟''
جی ہاں۔ پھر کھانوں کے چُورے کو دُودھ میں ڈال کر اتنا پکایئے کہ
دُودھ آدھا رہ جائے۔ ذائقے کے مطابق شکر ڈالیے۔ ذرا سی پسی الائچی
اور زعفران ڈالیے۔ (ٹھنڈا کر کے سرو کیجیے۔)

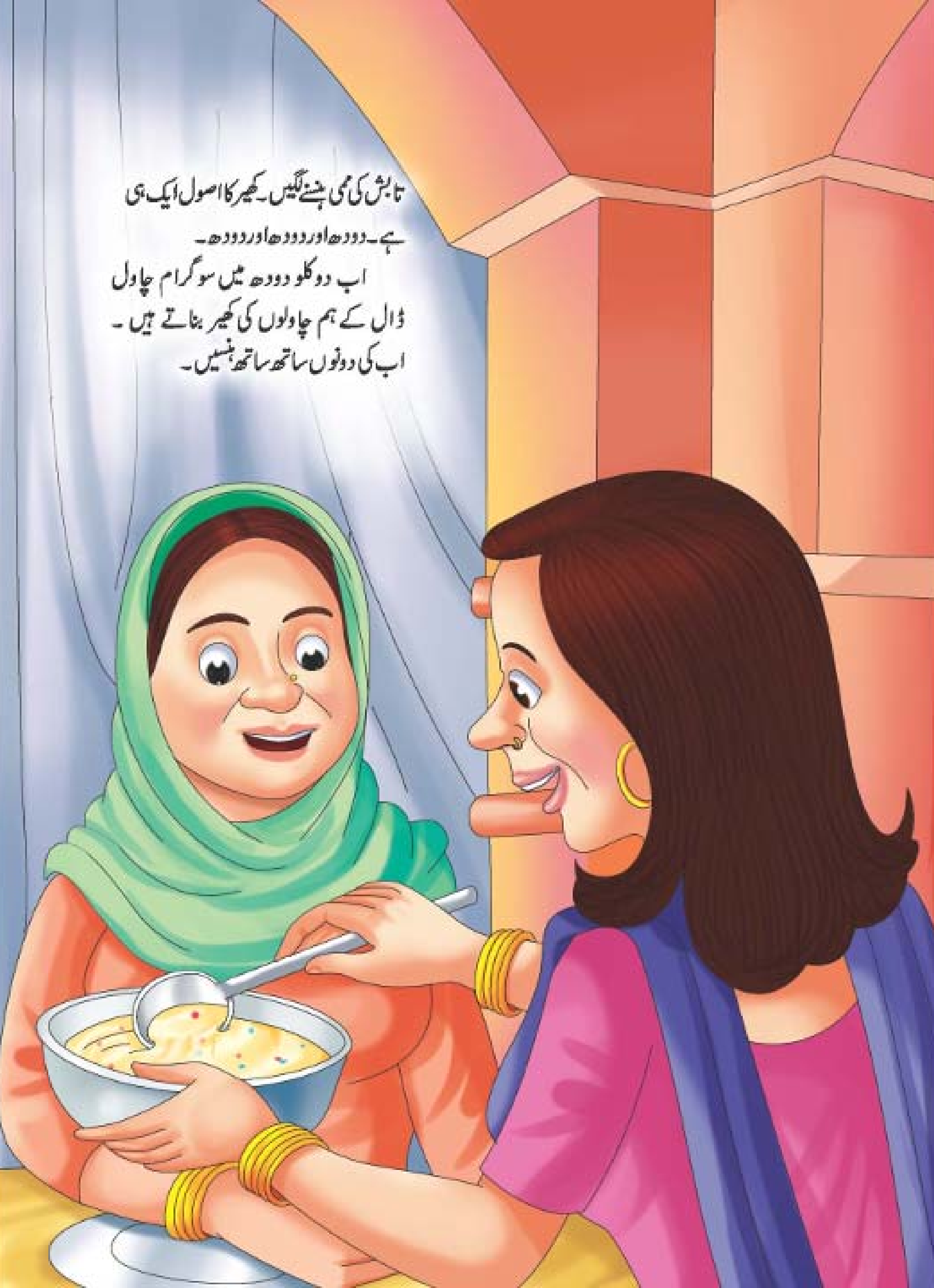

تابش کی ممی ہنسنے لگیں۔ کھیر کا اصول ایک ہی ہے۔ دودھ اور دودھ اور دودھ۔
اب دو کلو دودھ میں سو گرام چاول ڈال کے ہم چاولوں کی کھیر بناتے ہیں۔
اب کی دونوں ساتھ ساتھ ہنسیں۔

"آنٹی۔ہم آپ کو ماں کہیں۔ہمیں ماں کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔"
تابش نے چلتے وقت راجن کی ممی سے کہا۔
"ہاں بیٹا۔ضرور کہو۔تم راجن کے دوست ہو تو ہمارے بیٹے ہی جیسے ہوئے نا۔"

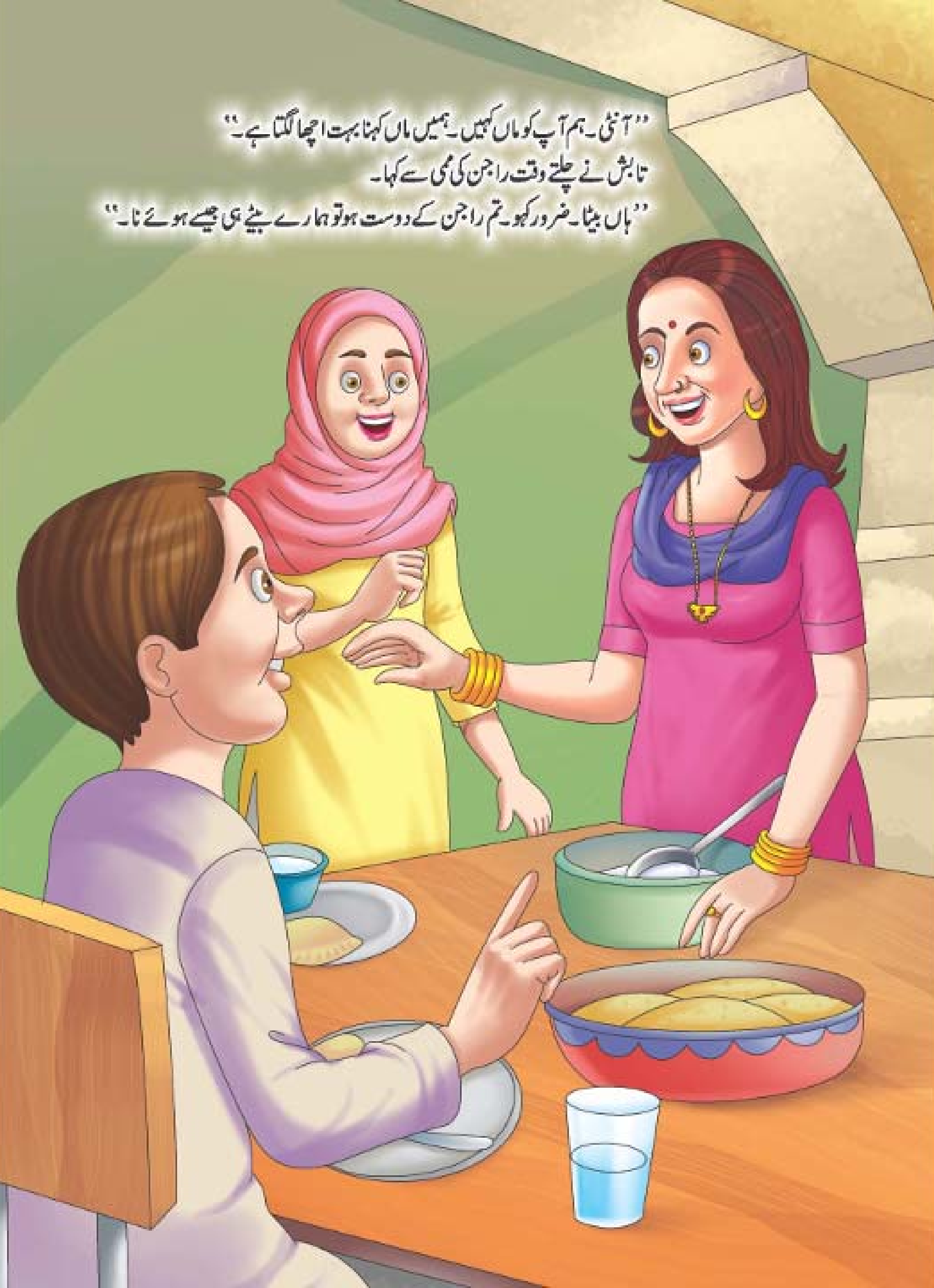

”ماں، تابش نے کہا۔ اگلی بار راجن ہمارے گھر آئے گا۔“

”ضرور جائے گا بیٹا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔“

”کیا؟“ تابش اور اس کی ممی دونوں نے ساتھ ساتھ کہا۔

”ہم لوگ ویجیٹیرئن ہیں۔ گوشت یا انڈے سے بنی کوئی چیز مت کھلانا۔

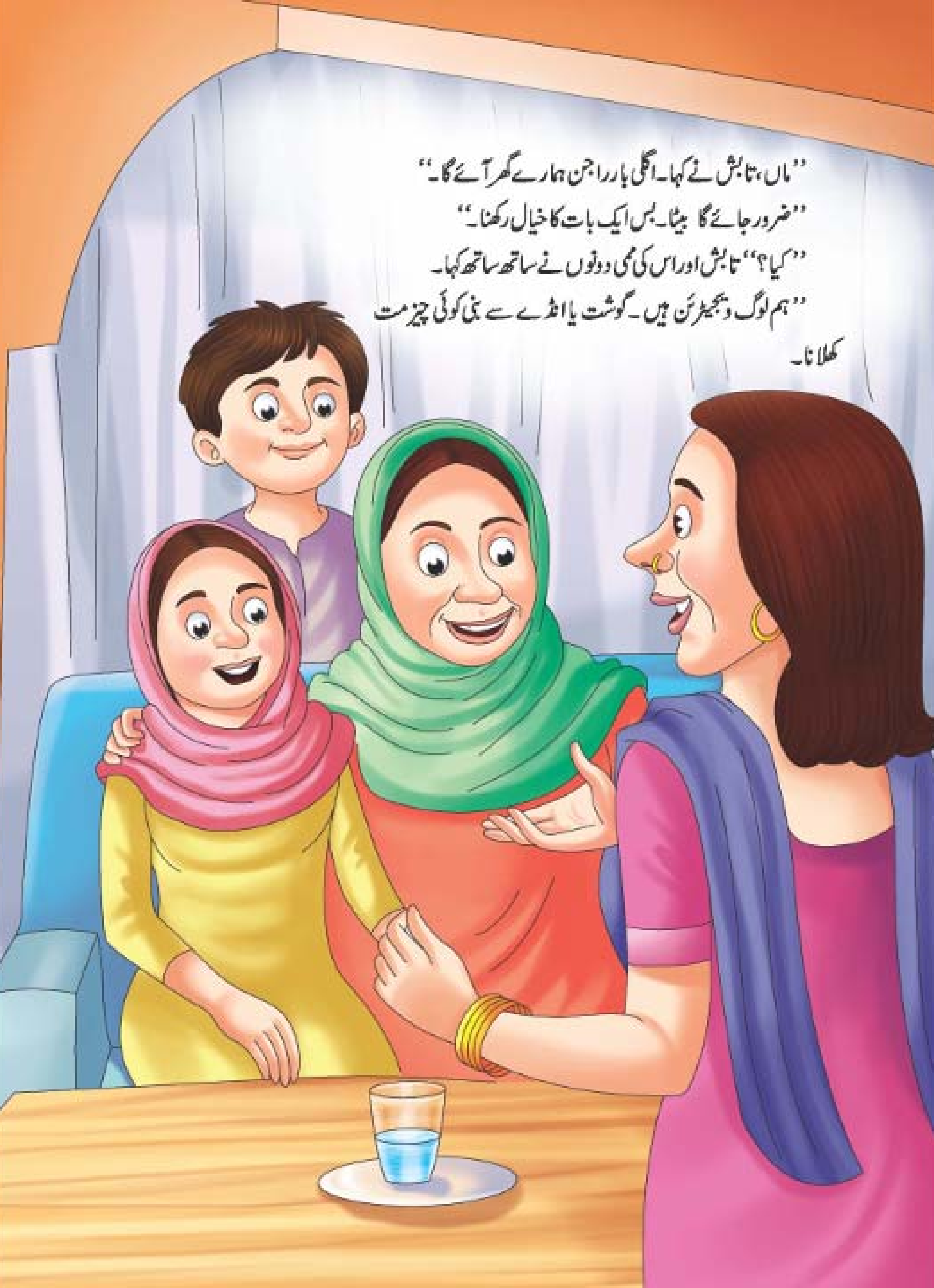

”یہاں ہمارے کھانے کے طور طریقے الگ ہو جاتے ہیں۔
تابش کی ممی نے سنجیدگی سے کہا۔ آپ گوشت انڈا مچھلی نہیں کھاتیں
جب کہ ہم کھاتے ہیں۔
لیکن کیا کافی نہیں کہ ایک چیز مشترک ہے۔ وہ قدرے رکیں
لیکن بچوں نے نعرہ لگایا۔
”کھانے کی کھیر ____“
”اور پیار کی مٹھاس بھی ____“ مینا مہیشوری نے تہمینہ صدیقی سے کہا۔

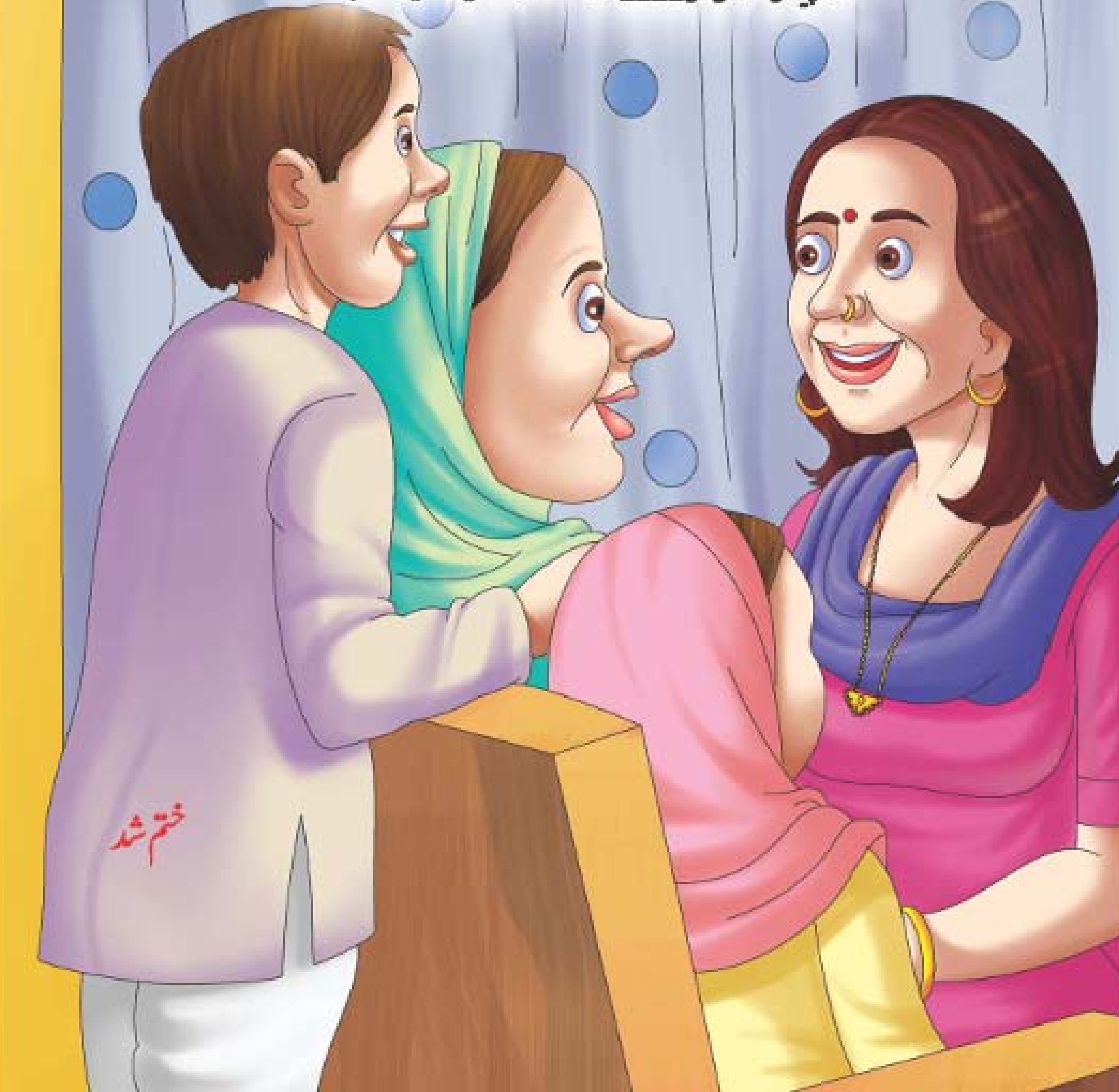

ختم شد

مصنف: جولز ورنی
مترجم: شکیل صدیقی

قسط وار ناول

دسویں قسط

زمین کی تہہ میں

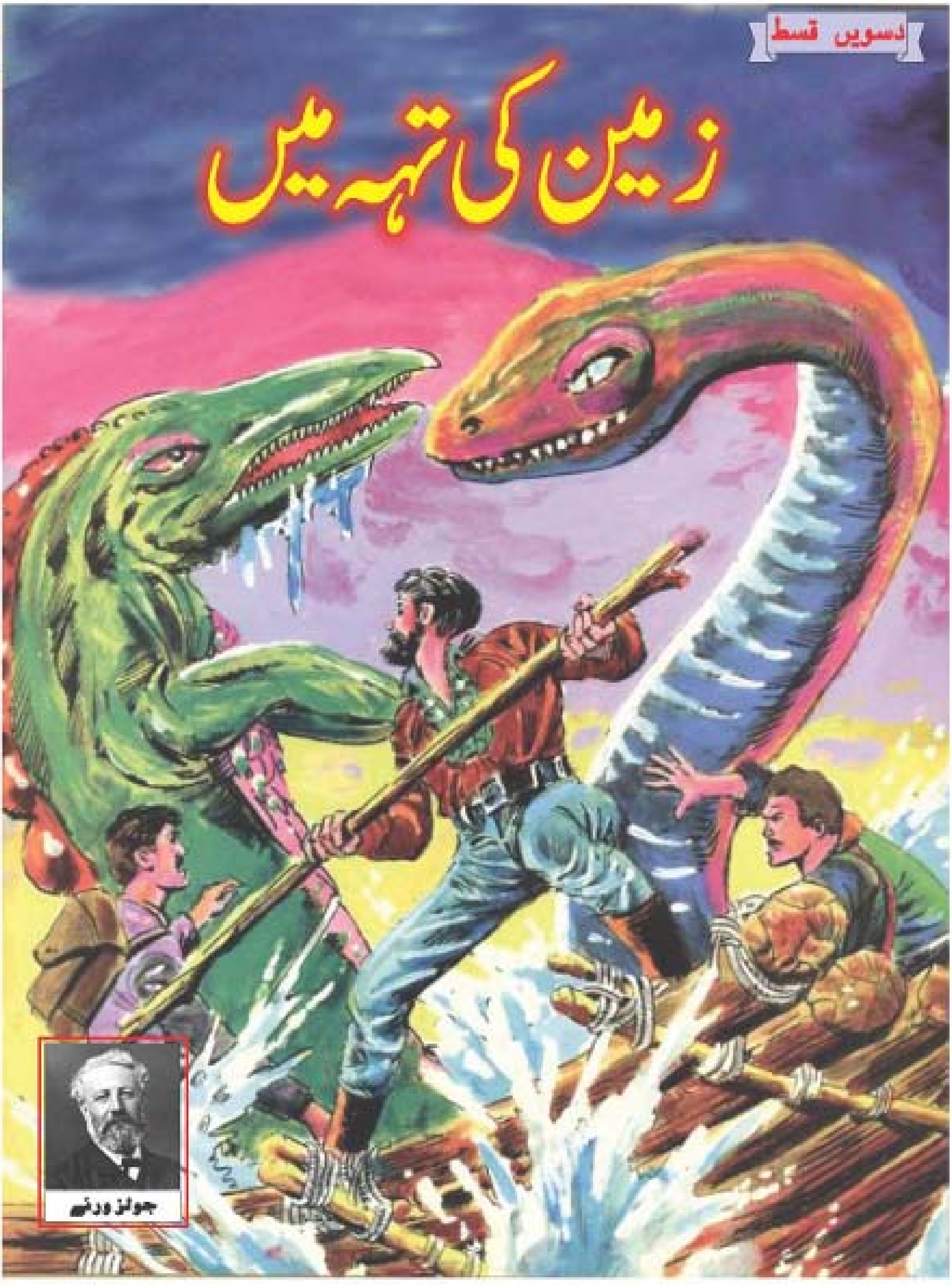

جولز ورنی

جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب و غریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب و غریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگیا۔ آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سنی فلز کا سفر شروع کیا۔ سنی فلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سنی فلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔ اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔ سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ چٹانوں سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک سرنگ میں پہنچے۔ سرنگ سے آگے انھیں کوئلے کی ایک کان ملتی ہے۔ کان میں آگے راستہ بند تھا اس لیے واپس لوٹے، جب تک پینے کا پانی ختم ہوچکا تھا۔ پروفیسر واپس جانے کو تیار نہیں تھے جبکہ البرٹ اور ہانس کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ کوئلے کی کان کے بعد تانبے اور ابرق کی کانوں سے گزرتے ہوئے دو دن اور بیت گئے۔ سارے لوگ نڈھال ہوچکے تھے۔ اس درمیان ایک دریا میں پانی بہنے کی آواز آتی ہے۔ بڑی مشکل سے چٹان توڑ کر ہانس نے پانی پینا چاہا لیکن یہ دریا گرم پانی کا تھا۔ بعد میں یہ پانی ٹھنڈا ہوگیا۔ بعد میں البرٹ پروفیسر سے بچھڑ جاتا ہے اور گرینائٹ کی چٹانوں پر پہنچ جاتا ہے۔ البرٹ کی لالٹین بھی بجھ چکی تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ اچانک البرٹ نیچے گرنے لگتا ہے۔ جب البرٹ کو ہوش آتا ہے تو اسے دور سے چچا اور ہانس کی آواز آتی ہے جو اُسے ہی تلاش کررہے تھے۔ بہت مشکل سے البرٹ اپنے چچا تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد سب لوگ دو دن آرام کرتے ہیں۔ پروفیسر نے کہا کہ اب تیار ہوجاؤ، سمندری سفر پر چلنا ہے۔ البرٹ گھبرا گیا کہ یہاں سمندر کہاں ہے۔ پروفیسر بروک نے جواب دیا کہ بحیرۂ بروک ہے اس کا نام، کیونکہ اسے میں نے تلاش کیا ہے۔ ہانس نے آس پاس کے درختوں کی لکڑیوں سے ایک بیڑا تیار کیا اور وہ سب لوگ اُس بیڑے میں بیٹھ کر اس عجیب و غریب سمندر میں اتر گئے جو زمین سے اٹھاسی میل نیچے تھا۔ اب آگے

قسط وار ناول

بحری سفر کی ابتدا

13 اگست کو ہم صبح ہی اٹھ گئے کیونکہ ہمیں اس نئے اور آسان راستے پر سفر کرنا تھا۔ ہم نے عرشے پر ضرورت کی ہر چیز رکھ دی تھی۔ کھانے پینے کا سامان، اوزار، ہتھیار، آگ تیار کرنے کا سامان اور تازہ پانی کی ایک بڑی مقدار۔ چھ بجے پروفیسر نے ہمیں بیڑے پر سوار ہونے کا حکم دیا۔

اس بیڑے کو ہانس چلا رہا تھا۔ میں نے وہ رسی کھول دی جس کے ذریعے سے ہم ساحل سے بندھے ہوئے تھے۔ بیڑا سمندر میں رواں ہوگیا۔ جب ہم بندرگاہ کو چھوڑ رہے تھے تو چچا جان نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اسے کوئی نام دینا چاہیے۔

''جولی۔'' میں نے تجویز کیا۔ ''آپ کو اپنے نقشے پر پورٹ جولی لکھتے ہوئے اچھا لگے گا۔''

''ہاں پورٹ جولی مناسب رہے گا۔'' چچا نے اس سے اتفاق کیا۔

ہوا اس وقت شمال مغرب سے چل رہی تھی، ہم اسے کاٹتے ہوئے تیزی سے سفر کر رہے تھے۔

''اگر ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو ہم چوبیس گھنٹوں میں 75 میل سفر طے کرلیں گے اور اس وقت ہم دوسرے کنارے پر پہنچ چکے ہوں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بیٹھ کر موجوں کو دیکھنے لگا۔ جلد ہی ہم اتنے آگے آگئے کہ کنارہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ دوپہر کے وقت سمندری گھاس کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ یہ سمندری گھاس بعض اوقات اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ بحری جہازوں کو روک لیتی ہے مگر بحیرہ بروک میں وہ ٹکڑے اتنے بڑے تھے کہ میں نے ان کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ میں حیران تھا کہ قدرت نے آخر سمندر کو ایسی کون سی قوت عطا کر رکھی ہے جو اس گھاس کو پیدا کرتی ہے۔

جب شام ہوئی تو زیادہ تاریکی نہیں پھیلی۔ اس سمندر کے اوپر روشنی یکساں تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں مستول کے پاس لیٹ کر سوگیا۔ مجھے خوب اچھی نیند آئی۔

چچا جان کی ہدایت کے مطابق دوسرے روز میں نے اس بحری سفر کی ڈائری لکھنا شروع کی۔ یہاں اس کے بارے میں وہ نوٹس جو میں نے تیار کیے ہیں۔

14 اگست، جمعہ۔

شمال مغرب سے ہوا مناسب انداز سے چل رہی ہے۔ بیڑا تیزی سے سیدھا چل رہا ہے۔ ساحل 75 میل کے فاصلے پر ہے۔ افق صاف ہے۔ روشنی یکساں ہے۔ موسم عمدہ ہے۔ درجہ حرارت بتیس درجہ سنٹی گریڈ ہے۔

دوپہر کو ہانس نے ایک فولادی کانٹے میں تھوڑا سا گوشت لگایا اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔ دو گھنٹے تک اسے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہم نے سوچنا شروع کردیا کہ شاید اس سمندر کا پانی مچھلیوں کی افزائش کے لیے نامناسب ہے مگر پھر ڈور کھنچنا شروع ہوئی اور جب ہانس نے اسے کھینچا تو ایک تڑپتی مچھلی باہر آگئی۔

ہم نے اس مچھلی کو اچھی طرح سے دیکھا بھالا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ مچھلی کی طرح ہے، مگر اس کے باوجود وہ مختلف تھی۔ مثال کے طور پر اس کی دُم اور دانت نہیں تھے۔ پروفیسر نے بتایا کہ یہ مچھلی کی ایسی کوئی قسم ہے جس کی نسل ختم ہوچکی ہے اور اب انسان اس کا ڈھانچہ کہیں سے کھود کر دریافت

کر لیتا ہے۔

"کیا!" میں حیرت سے چیخ پڑا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ ہم نے ایک ایسی مچھلی پکڑ لی ہے جس کی نسل ختم ہو چکی ہے۔"

"ہاں!" پروفیسر نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا "اور تمھیں اس میں ایک خاص بات دکھائی دے گی۔ یہ مچھلی جو زیر زمین پانی میں ملی ہے، اس میں ایک خاص بات ہے۔"

"ارے ہاں۔ یہ تو اندھی ہے۔" میں نے چونک کر کہا۔

"اندھی نہیں، بلکہ اس کی آنکھیں ہی نہیں ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر مچھلی کی طرف دیکھا۔ میرے چچا جو کچھ کہہ رہے تھے وہ سچ تھا مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ تمام مچھلیاں ایسی ہی ملتیں اس لیے ہم نے دوسری طرف کانٹا ڈالا۔ دو گھنٹوں میں ہم نے بہت سی مچھلیاں پکڑیں، مگر وہ سب ایسی تھیں جن کی نسل ختم ہو چکی تھی۔ ان میں سے کسی کی بھی آنکھیں نہیں تھیں۔

میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اگر یہاں ایسی مچھلیاں مل رہی تھیں تو ایسے پرندے کیوں نہیں مل سکتے تھے، جو ان مچھلیوں کا شکار کر کے زندہ رہتے ہیں۔

میرا تصور مجھے کہیں دور لے گیا اور میں قبل از تاریخ کے زمانے کے خواب جاگتی حالت میں دیکھنے لگا۔ پہلے دیوزاد جانوروں کے متعلق، پھر بڑے پرندوں کے متعلق، اور آخر میں رینگنے والے جانوروں کے متعلق جو ان سے پہلے آئے تھے۔

رفتہ رفتہ میں پہلے کے زمانے میں چلا گیا اور جانوروں سے پہلے کے زمانے کے متعلق خواب دیکھنے لگا، جب شدید گرمی میں صرف پودے اور درخت ہی دنیا میں ہوا کرتے تھے۔ پھر میں نے درختوں سے پہلے کے زمانے کو تصور میں دیکھا جب پہاڑ بھی نہیں تھے اور دنیا گیسوں کا مجموعہ تھی۔ گرم ترین جسامت، میں بڑی اور سورج کی طرح چمک دار۔ کیسا عجیب خواب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے بخار ہو گیا ہو اور میرے خیالات عجیب عجیب چیزیں دکھا رہے ہوں۔ میں نے اس خواب کی تمام تفصیل لکھ لی اور اس دوران میں دوسری تمام

چیزیں بھول گیا یعنی پروفیسر گائڈ اور بیڑا مجھے یاد نہ رہا۔

''کیا بات ہے؟'' میرے چچا نے پوچھا۔

میں نے ان کی طرف نظریں اٹھائیں لیکن میرے خیالات کہیں اور تھے لہٰذا وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔

''محتاط رہو البرٹ ورنہ بیڑے سے گر کر پانی میں ڈوب جاؤ گے۔''

میں نے محسوس کیا کہ ہانس نے مجھے تھام رکھا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں سمندر میں گر پڑتا۔

''کیا تم دیوانے ہو گئے ہو؟'' پروفیسر نے چیخ کر کہا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''کیا تم بیمار ہو؟''

''نہیں خواب دیکھ رہا تھا بہرحال اب وہ ختم ہو گیا..... سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، ہوا مناسب ہے اور سمندر بھی پرسکون ہے۔ ہمیں جلد ہی خشکی تک پہنچ جانا چاہیے۔''

میں نے کھڑے ہو کر افق کی طرف دیکھا۔ اب بھی سمندر اور بادلوں کے درمیان کچھ نہیں تھا۔

15 اگست، ہفتہ

ابھی تک زمین دکھائی نہیں دی۔ چچا جان کا مزاج خراب تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا غصہ اور اضطراب لوٹ آیا ہے۔

''چچا آپ کچھ فکر مند سے ہیں؟'' میں نے انھیں ٹیلی اسکپ سے افق کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے کہا۔

''فکر مند؟ ذرا بھی نہیں۔''

''مضطرب سے ہیں؟''

''ہاں۔ تھوڑا سا۔''

''مگر ہم تو بہت تیزی سے سفر کر رہے ہیں۔''

''اس سے کیا فائدہ؟ یہ سمندر بہت بڑا ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ پروفیسر نے اندازہ قائم کیا تھا کہ بحیرۂ بروک چوڑائی میں پچھتر میل ہے اور اب تک ہم ان کا تین گنا سفر کر چکے ہوں گے مگر جنوبی ساحل نظر نہیں آرہا ہے۔

''ہم نیچے نہیں جا رہے ہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ میں اس سفر پر اس لیے نہیں آیا تھا کہ ایک تالاب میں تیرتا رہوں۔''

وہ اس سفر کو تیرنا اور اس سمندر کو تالاب کہہ رہے تھے!

''مگر۔'' میں نے کہا ''ہم تو اس راستے پر چل رہے ہیں جو آرنی نے اختیار کیا تھا۔''

''کیا واقعی؟'' چچا جان نے کہا۔ ''کیا آرنی اس سمندر تک آیا تھا؟ کیا اس نے اسے پار کیا تھا؟ کیا اس چشمے نے ہمیں صحیح راستے پر ڈالا ہے؟''

''بہرحال آپ کے خیالات فکر انگیز ہیں اور..... ''

''مجھے خیالات کی پروا نہیں ہے۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کرنے جا رہا ہوں۔ اس لیے مجھ سے خیالات کی بات مت کرو۔''

میں نے چچا جان کو تنہا چھوڑ دیا اس لیے کہ وہ مضطرب اور منتشر تھے۔ چھ بجے شام کو ہانس نے اپنی اجرت کا سوال کیا تو اسے رقم گن کر ادا کر دی گئی۔

16 اگست اتوار۔

کوئی نئی بات پیش نہیں آئی۔ موسم پہلے جیسا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے بجلی کا بلب روشن کر رکھا ہو۔ ہوا میں البتہ تھوڑی سی تازگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سمندر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ بحر اوقیانوس یا بحر روم کی طرح بڑا سمندر لگ رہا تھا۔

چچا جان نے سب سے بھاری کلہاڑی اٹھائی اور اس کے ہتھے میں رسی باندھ کر اسے سمندر میں ڈال دیا۔ وہ کلہاڑی بارہ سو فیٹ نیچے چلی گئی مگر سمندر کی تہہ نہ ملی۔ کلہاڑی کو واپس کھینچنے میں بہت دشواری پیش آئی۔

جب کلہاڑی اوپر تک گئی تو انھوں نے مجھے دکھائی کہ اس پر گہرے نشانات پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''دانت!'' میں نے حیرت سے دہرایا۔ پھر کلہاڑی پر پڑے ہوئے نشانات کو غور سے دیکھا۔ ہاں کلہاڑی پر دانتوں کے نشانات تھے، بہت طاقتور اور گہرے! کیا وہ قبل از تاریخ کے کسی عفریت کے دانتوں کے نشانات تھے جو سمندر کی تہہ میں رہ رہا تھا؟ کیا وہ عفریت وہیل اور شارک سے زیادہ مہیب اور ڈراؤنا ہوگا؟ میں نے کھلی آنکھوں سے جو خواب دیکھا تھا کیا وہ سچ ثابت ہونے والا ہے؟ میں اس خیال کو ذہن سے نہ نکال سکا۔

17 اگست، پیر

میں سارا دن ان دانتوں کے نشانات کے بارے میں اور اس رینگنے والے جانور کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔ کیا میری ملاقات قبل از تاریخ کے کسی عفریت سے ہونے والی تھی؟ میں نے دہشت سے سمندر کی طرف دیکھا؟ پروفیسر بروک کا بھی تقریباً یہی خیال تھا اس لیے کہ وہ بار بار کلہاڑی کا جائزہ لے رہے تھے۔ البتہ وہ میری طرح خوف زدہ نہیں تھے۔

انھوں نے وہ کلہاڑی سمندر میں کیوں ڈالی تھی؟ میں نے خود سے کہا۔ اس سے کوئی عفریت پریشان ہوگیا ہے جو ہم پر حملہ کرسکتا ہے۔

میں نے اپنی بندوقوں کی طرف دیکھا کہ وہ وقت پر کام کرسکتی ہے یا نہیں؟

سمندر کی سطح پر مختلف لہریے بن رہے تھے۔ خطرہ قریب تھا۔ ہمیں محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے تھا۔

18 اگست، منگل

شام ہوچکی تھی، روشنی یکساں اور ایک ہی قسم کی تھی لہٰذا

اس سے وقت کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا، یا بہت زیادہ تھک گئے تھے اس لیے ہم نے یہ اندازہ لگالیا۔ ہانس مسلسل بیڑے کو چلا رہا تھا، مجھے نیند آنے لگی۔

دو گھنٹے بعد میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ بیڑا سمندر کی سطح سے تقریباً سو فیٹ یا اس سے زیادہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میرے چچا چیخے ''کیا ہم خشکی پر پہنچ گئے ہیں؟''

ہانس نے ایک سیاہ چیز کی طرف اشارہ کیا جو چوتھائی میل کے فاصلے پر سمندر سے نکل رہی اور ڈوب رہی تھی۔

''یہ کوئی دیوزاد مچھلی ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''ہاں۔'' چچا جان نے کہا۔ ''اور وہ ادھر کوئی دیو قامت سمندری چھپکلی ہے۔''

''اور اس سے بھی آگے ایک بہت بڑا مگرمچھ ہے۔ اس کے بڑے بڑے دانتوں کی قطار کو دیکھیے۔ اوہ! وہ نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔''

''یہ وہیل ہے..... وہیل ہے۔'' چچا چلائے۔ ''پانی کی طرف دیکھو..... وہ فوارے کی طرح گر رہا ہے۔''

ہم تعجب اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں کھڑے ان سمندری عفریتوں کو دیکھتے رہے۔ ان میں سے جو سب سے چھوٹا تھا وہ ہمارے بیڑے کو چبا کر ٹکڑے کر سکتا تھا۔ ہانس مڑنا چاہتا تھا، مگر دوسری طرف سے اسے ایک بہت بڑا کچھوا دکھائی دیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ وہ کچھوا تقریباً چالیس فیٹ لمبا تھا اور اس نے تیس فیٹ لمبے ایک سانپ کا سر منہ میں دبا رکھا تھا اور اسے دائیں بائیں لہروں پر پٹخ رہا تھا۔ ان سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ وہ سارے جانور تیزی سے بیڑے کے نزدیک آ رہے تھے۔ میں نے اپنی رائفل اٹھالی، مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ اس کی ننھی سی گولی ان عفریت کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟

خوف اور دہشت سے ہمیں سکتہ ہو گیا تھا۔ مگرمچھ اور سانپ تیزی سے قریب آ رہے تھے جبکہ باقی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں فائر کرنے کے لیے تیار تھا، مگر ہانس نے مجھے روک دیا۔ وہ دونوں عفریت ہمارے بیڑے سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے سے گزر گئے اور انھوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

پھر تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر جنگ شروع ہو گئی۔ ہمیں دونوں عفریت ایک دوسرے کو اپنے دانتوں میں دبائے نظر آ رہے تھے۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ دوسرے عفریت واپس آ گئے ہیں اور اس جنگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں ہانس کی توجہ اس طرف دلائی مگر اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''صرف دو جانور ہیں۔'' وہ بولا۔

''یہ درست کہہ رہا ہے۔'' میرے چچا نے کہا جو ٹیلی اسکوپ لیے ہوئے تھے۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''ہاں۔ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ان عفریتوں میں سے پہلے کی ناک مچھلی کی طرح، سر چھپکلی جیسا اور دانت مگرمچھ جیسے تھے۔ وہ قبل از تاریخ کا سب سے دہشت ناک جانور اکتھیو سارس ہے۔''

''اور دوسرے؟''

''دوسرا پہلے کا دشمن ہے۔ ایک سانپ جس کا خول کچھوے جیسا ہے اسے پیلیسورس کہتے ہیں۔''

ہانس صحیح کہہ رہا تھا۔ سمندر کی سطح پر صرف دو عفریت کلبلا رہے تھے۔ ایک اکتھیو سارس جو تقریباً سو فیٹ لمبا تھا اور جس کی آنکھیں کسی شخص کے سر کے برابر تھیں، اور ایک پیلیسورس

جس کی گردن سمندر سے تیس فٹ اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

وہ دونوں شدید غصے میں ایک دوسرے پر اس طرح حملہ آور ہو رہے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ان کی لڑائی سے پانی کی سطح پر اتنی اونچی اونچی لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور ہمارے بیڑے تک پہنچ رہی تھیں کہ وہ الٹتے الٹتے بچا۔ وہ لڑائی میں مہیب آوازیں نکال رہے تھے اور ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عفریت کہاں سے شروع ہوتا اور دوسرا کہاں ختم ہوتا ہے۔

ایک گھنٹہ، اور پھر دو گھنٹے گزر گئے اور لڑائی پوری شدت سے جاری رہی۔ ہم حرکت کے بغیر اپنی جگہوں پر کھڑے تھے اور فائرنگ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

اچانک دونوں عفریت سطح کے نیچے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے سوچا کیا ان کی لڑائی سمندر کی تہ میں جا کر ختم ہو گی؟''

چند منٹ اس طرح گزر گئے۔ پھر ایک بڑا سر سطح پر نمودار ہوا جو پلیسوسورس کا تھا۔ وہ مر رہا تھا اور اپنا سر کرب و اذیت میں سطح پر مار رہا تھا۔ پانی چھینٹوں کی صورت میں اڑ رہا اور ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر جلد ہی اس کی شدت اور غیظ و غضب کم ہو گیا اور سانپ کا جسم پانی کی پرسکون لہروں پر تیرنے لگا۔

19 اگست، بدھ

ہماری خوش قسمتی سے تیز ہوا چلنے لگی اور جلد ہی ہمیں اس لڑائی کے منظر سے دور لے گئی ہانس اب بھی بیڑے کو کھے رہا ہے۔ چچا جان اضطراب اور بے چینی سے افق کو دیکھ رہے ہیں۔

20 اگست، جمعرات

ہوا نارمل تھی۔ درجہ حرارت بلند۔ بیڑے کی رفتار نوے ناٹ تھی۔ دوپہر کے قریب ہم نے کافی فاصلے سے ایک گرج سنی جو مسلسل آرہی تھی۔

ہانس نے مستول پر چڑھ کر دیکھا مگر اسے کچھ نظر نہیں آیا۔

تین گھنٹے گزر گئے۔ وہ گھن گرج کسی آبشار کی معلوم ہوتی تھی، میں نے اپنے خیال سے چچا کو آگاہ کیا تو انھوں نے انکار میں سر ہلایا۔ بہرحال چند میل کے فاصلے پر نہ کوئی چیز شور مچا رہی تھی۔ وہ آواز نہ آسمان کی طرف سے آرہی تھی نہ سمندر کی طرف سے۔ دونوں پر سکوت چھایا ہوا تھا۔

چار بجے کے قریب ہانس جو دوبارہ مستول پر چڑھ گیا، اس کی نگاہ افق کا جائزہ لے رہی تھی پھر اس نے ایک مخصوص نقطے پر نظر جما دی۔

''اس کو کوئی خاص چیز نظر آگئی ہے؟'' چچا جان نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے بھی اس کا یقین ہے۔''

''ہانس نیچے آیا اور اس نے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ وہاں پر۔'' اس نے کہا۔

چچا نے اپنی ٹیلی اسکوپ سے اس طرف دیکھا اور چیخ کر کہا۔ ''ہاں۔ ہاں۔''

''آپ کو کیا نظر آرہا ہے؟''

''پانی کا ایک اونچا ستون سطح پر بلند ہو رہا ہے۔''

''کوئی دوسرا عفریت؟''

''غالباً۔''

''پھر ہمیں چاہیے کہ بیڑے کا رخ مغرب کی طرف کر دیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ عفریت کتنے خطرناک ہیں۔''

''نہیں سیدھے چلو۔'' چچا نے کہا۔

میں ہانس کی طرف مڑا، مگر وہ بیڑے کو چلاتا رہا۔ جیسے جیسے ہم اس ستون کے قریب ہوتے جا رہے تھے ویسے ویسے وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بلند معلوم ہو رہا تھا۔ یہ کون سی ایسی سمندری مخلوق تھی جو اتنا پانی اُچھال رہی تھی؟

شام آٹھ بجے ہم اس عفریت سے پانچ میل سے بھی کم فاصلے پر تھے۔ اس کا لمبا چوڑا جسم پانی کی سطح پر ساکت پڑا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی لمبائی ایک میل ہو! فضا میں پانی کا ایک ستون پانچ سو فیٹ تک بلند تھا اور بارش کی صورت میں واپس نیچے گر رہا تھا۔

ہم ایک طاقتور عفریت کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا مقابلہ سو وھیلیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ خوف و دہشت کی ایک لہر نے مجھے جکڑ لیا۔

اچانک ہانس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ’’جزیرہ۔‘‘

’’جزیرہ؟‘‘ میں نے شبہ ظاہر کیا۔

’’ہاں، کیوں؟‘‘ چچا نے جواب دیا اور پھر قہقہے لگانے لگے۔

’’مگر آپ پانی کے اس ستون کو کیا کہیں گے؟‘‘

’’یہ گرم چشمے کا فوارہ ہے۔‘‘ ہانس نے وضاحت کی۔

’’ہاں یقیناً ہوگا۔‘‘ میرے چچا نے اس کی تائید کی۔ آئس لینڈ میں ایسے بہت سے فوارے ہیں۔‘‘

پہلے مجھے اس پر یقین نہیں آیا کہ میں نے ایک جزیرے کو عفریت سمجھ لیا، مگر اس کا ثبوت سامنے تھا اور مجھے اسے تسلیم کرنا پڑا۔

وہ جزیرہ کسی وھیل کی طرح تھا جس کا سر سطح سے ساٹھ فٹ بلند تھا۔ کبھی کبھار ہمیں زوردار دھماکہ سنائی دیتا تھا اور پھر آسمان کی طرف پانی کا ایک ستون بلند ہو کر بادلوں تک چلا جاتا۔ بجلی کی روشنی اس کے ساتھ مل کر نت نئے رنگ پیدا کر رہی تھی۔

’’آؤ ہم اس پر اتر جائیں۔‘‘ پروفیسر نے کہا۔

ہانس نے کافی دوری سے بیڑے کا رخ اس جزیرے کی طرف کیا۔ خشکی کے نزدیک پہنچتے ہی میں نے چٹانوں پر چھلانگ لگائی اور میرے بعد چچا جان نے خشکی پر قدم رکھا۔ جبکہ ہانس بغیر کسی تجسس کے بیڑے پر کھڑا رہا۔

زمین ہمارے قدموں تلے تھرتھرا رہی تھی، اور قدرے گرم معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس چشمے پر تھرمامیٹر لگایا جہاں سے فوارہ بلند ہو رہا تھا تو اس نے درجۂ حرارت 163 ظاہر کیا۔ یہ پانی کسی بھٹی سے گزر کر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زمین کے مرکز میں گرمی ہے۔

میں نے یہ بات پروفیسر بروک سے کہی۔

’’ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔‘‘ انھوں نے صرف اتنا کہا۔

اس جزیرے کا نام ’البرٹ‘ رکھ کر وہ پھر بیڑے پر چلے گئے۔ ہماری غیر موجودگی میں ہانس نے بیڑے کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ ہم اس پر پہنچے تو ہانس نے اسے چلانا شروع کر دیا۔

اب ہم پورٹ جولی سے چھ سو پچیس میل اور آئس لینڈ سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر آ چکے تھے۔ ■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جول ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل

باغبان زینب رفیق اے ایچ

دنیا کے وہ 6 مقامات جہاں جانے کی کسی کو اجازت نہیں

دنیا میں چھ ایسے مقامات ہیں جو بے حد مشہور ہیں۔ لیکن وہاں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ ان مقامات کی حقیقت جاننے کے بعد آپ بھی کہیں گے کہ یہ پابندی ٹھیک ہی ہے:

(1) سانپوں کا جزیرہ: یہ جزیرہ برازیل میں واقع ہے جہاں ہر طرف سانپ ہی سانپ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بے حد زہریلے سانپ ہیں جو جزیرے کے چپے چپے پر پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برازیل کی حکومت نے اس جزیرے کی جانب انسانوں کا جانا ممنوع قرار دے رکھا ہے۔

(2) ایریا فائیو ون: یہ مقام امریکی ریاست نیواڈا کے صحرا میں واقع ہے۔ آپ اسے سائنس فکشن فلموں میں تو دیکھ سکتے ہیں لیکن یہاں کسی عام انسان کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی حکومت نے خلائی مخلوقات پر تحقیق کے لیے کوئی مرکز قائم کر رکھا ہے۔

(3) ثوال بارڈ سیڈ والٹ: یہ ناروے کے ایک گلیشیر پر قائم کیا گیا سائنسی مرکز ہے۔ اس کے اندر پوری دنیا سے اکٹھے کیے گئے مختلف اقسام کے بیجوں کا ذخیرہ کیا گیا ہے تاکہ دنیا پر کسی بڑی آفت کے نزول کے بعد نباتاتی حیات کا خاتمہ ہو جائے تو یہاں سے بیج لے کر دوبارہ فصلیں اگانے کا آغاز کیا جا سکے۔

(4) نارتھ سینٹی نل آئی لینڈ: یہ ایک جزیرہ ہے جو بحیرہ ہند میں واقع ہے۔ تاریخ داں کہتے ہیں کہ یہاں آباد سینٹی نلیز قبیلہ دنیا کے قدیم ترین انسانوں کی نسل سے ہے۔ یہ لوگ آج بھی برہنہ حالت میں غاروں کے اندر رہتے ہیں۔ یہ لوگ جدید دنیا کے کسی بھی انسان کو اپنے جزیرے کے قریب آتا دیکھیں تو اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جزیرے کے پاس جانے کی بھی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی۔

(5) کن شی ہوان کا مقبرہ: یہ مقبرہ چین میں واقع ہے اور اس کا تعلق 210 میل قبل مسیح میں چینی سلطنت کے حکمراں کن شی ہوان سے ہے۔ قدیم چینی روایات کے مطابق کسی کو بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ شہنشاہ کے آرام میں خلل ڈالے، لہٰذا اس مقبرے کے قریب جانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی۔

(6) پووینگلیا: یہ خوبصورت اطالوی شہر وینس کے قریب واقع ایک جزیرہ ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جب یورپ میں طاعون کی وبا پھیلی تو متاثرہ لوگوں کو اس جزیرے پر بھیج دیا جاتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس جزیرے پر لاکھوں طاعون کے مریضوں نے اپنی آخری سانسیں لیں۔ اطالوی حکومت نے اس خوفناک جزیرے کی جانب جانا ممنوع قرار دے رکھا ہے۔

■

Bagban Zainab Rafeeque AH
J.A.T Girls High School
Malegaon, Dist: Nasik (Maharashtra)

فیاض احمد

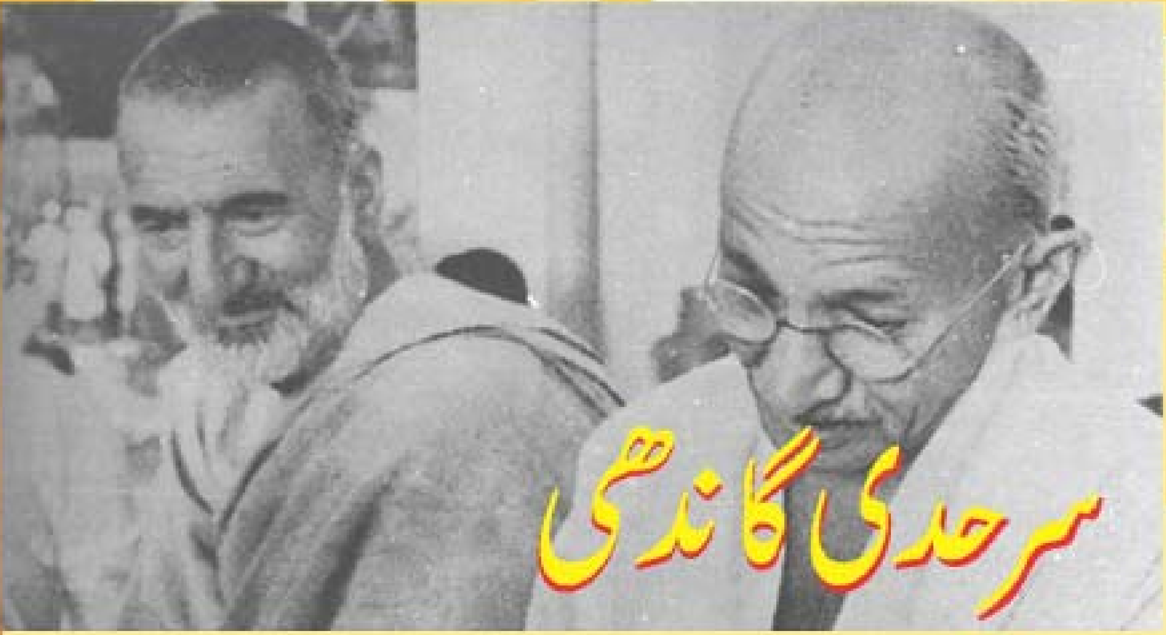

سرحدی گاندھی

ہندوستان کی آزادی کے سپاہی اور گاندھی جی کے دوست و ساتھی خان عبدالغفار خان کو کون نہیں جانتا۔ انھیں اکثر سرحدی گاندھی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

خان عبدالغفار خان کی پیدائش 6 فروری 1890 کو ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے سرحدی علاقہ اتمان زئی میں ہوئی تھی۔ چونکہ وہ گاندھی جی کے دوست تھے اور ان ہی کی طرح عدم تشدد یعنی اہنسا کے پجاری تھے اسی نسبت سے وہ سرحدی گاندھی کہلائے۔ خان صاحب نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی ایک پاٹھ شالہ میں پائی۔ بعد میں بمبئی کے ایک مشن اسکول میں آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا۔

خان عبدالغفار خان ایک پٹھان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پٹھان قوم تعلیم یافتہ ہوتا کہ ان کی حالت سدھرے۔ مگر اس وقت انگریزی حکومت نے انھیں ایسا کرنے سے روکا اور ان کے مدارس بند کروادیے۔ خان صاحب کو اپنی مادری زبان پشتو سے بہت محبت تھی اور وہ اس کی ترقی کے لیے کوشاں بھی تھے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ایک مدرسے کی بھی بنیاد ڈالی مگر انگریزی حکومت ان سے خوف زدہ تھی اور اس ڈر سے ان کے مدرسوں کو بند کروادیا کہ اگر پٹھان پڑھ لکھ گئے تو وہ انھیں زیادہ دنوں تک غلام بنا کر نہیں رکھ سکے گی۔ وہ اپنے دھن کے پکے تھے۔ انھوں نے تعلیم کا چرچا نہیں چھوڑا۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتے اور لوگوں سے تعلیم حاصل کرنے کی اپیل کرتے۔ اب انگریز ان سے بے حد خوف زدہ ہوگئے تھے۔ آخر کار انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ تین سال وہ جیل میں بند رہے۔ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ان کی والدہ کی موت کی خبر بھی ان کو اخبار سے ملی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور دل میں تہیہ کر لیا کہ ہندوستان کی آزادی اور تعلیم کا چرچا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

تین سال بعد انھیں جیل سے رہائی ملی۔ وہ اپنے گاؤں لوٹے تو لوگ بہت خوش ہوئے۔ تعلیم کا چرچا چل پڑا تھا۔ بچے اور بڑے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عبدالغفار خان نے خدا کا

شکر ادا کیا۔

1913 میں خان عبدالغفار خان نے مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کی۔ کانفرنس میں انگریزوں کے ہاتھوں ظلم کی داستان سن کر ان کا دل دہل اٹھا۔ پھر 1929 میں لاہور میں کانگریس کے اجلاس میں بھی آپ نے شرکت کی۔ آپ کو بڑی ہمت ملی۔ گاؤں واپس آکر انہوں نے لوگوں کو ہندوستان کی آزادی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ لوگ انگریزی حکومت سے خوف زدہ تھے مگر عبدالغفار خان نے انھیں ہمت دی۔ لوگوں میں نئی روح پڑ گئی۔ اب انھیں کسی کا ڈر نہیں رہا۔ پٹھان بہت جلد تشدد پر اتر آتے تھے مگر آپ نے انھیں اہنسا کا راستہ دکھلایا۔ ان کی تحریک آگ پکڑنے لگی۔ لوگ پرامن احتجاج کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے، جلسے کرتے تھے۔ ان کا مقصد صرف ہندوستان کی آزادی تھی۔ پہلے چند پھر ہزاروں اور آہستہ آہستہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ ساتھ آگئے۔ یہ لوگ 'خدائی خدمت گار' کہلاتے تھے اور سرخ رنگ کا لباس ان کی پہچان تھی۔ انگریزی سرکار ان کی تعداد اور کام سے بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ ہر اس شخص کو جو سرخ لباس میں نظر آتا تھا اسے مارا پیٹا جاتا اور آخر کار جیل میں ٹھونس دیا جاتا۔ ہندوستان کی آزادی میں پٹھان قوم بھی آگے آگے رہی تھی۔

انگریز بھولے بھالے لوگوں کو عبدالغفار خان کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ وہی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو والی پالیسی۔ وہ کہتے غفار خان مسلمان ہے اسے دوسری قوم اور ہندوستان کی آزادی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، وہ ہندوستان کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔ کئی لوگ انگریزوں کی اس چال میں آگئے اور خدائی خدمت گار سے الگ ہوگئے۔ تب دادا بھائی نوروجی نے کہا: غفار خان مذہب سے اوپر ہے۔ گاندھی جی نے بھی سمجھایا: دھوکے میں مت آؤ اپنے آدمی کو پہچانو۔

خان عبدالغفار خان چاہتے تھے کہ پٹھانوں کو ان ہی کے علاقے میں پوری آزادی سے رہنے دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ پختونستان ریاست بنائی جائے۔ وہ تو تقسیم ہند کے سخت خلاف تھے مگر کچھ لوگوں نے ان کو غلط سمجھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد پنجاب کا وہ حصہ جہاں وہ رہتے تھے پاکستان کے حصے میں چلا گیا۔ غفار خان نے وہاں بھی پٹھانوں کے حق کا مطالبہ کیا تو پاکستانی حکومت نے انھیں جیل میں ڈال دیا۔ موت کے وقت بھی وہ اپنے ہی گھر میں نظر بند تھے۔

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان بہت ہی سادہ انسان تھے۔ ایک بار گاندھی جی نے ان سے کہا: غفار خان اس بار تم کانگریس کے صدر بن جاؤ۔ غفار خان نے سر جھکا کر کہا: باپو، میں عمر بھر سپاہی رہا ہوں اور ایک سپاہی کی ہی طرح مرنا چاہوں گا۔ یہ سن کر گاندھی جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غفار خان اکثر گاندھی جی کو قرآن پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور باپو بڑے غور سے سنا کرتے تھے۔ یہ تھی ان کی دوستی۔ قوم کی خدمت کے لیے ہندوستان نے انھیں 1987 میں بھارت رتن سے نوازا۔ خان صاحب نے لمبی عمر پائی اور 20 جنوری 1988 کو آخری سانس لی۔ ان کی قبر جلال آباد، افغانستان میں ہے۔

واقعی خان عبدالغفار خان ایک سادہ انسان تھے جو جیے تو قوم و ملک کے لیے اور اس دنیا سے گئے تو یہ پیغام دے گئے کہ خدائی خدمت گار کبھی نہیں مرتے۔

■

Faiyaz Ahmad
South Bazar, Post Andal - 713321
Distt.: Pachchim Bardhman (WB)

سنہری باتیں

- اگر زندگی میں کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو اسے دکھ بھی مت دو۔
- اگر کسی کو کوئی تحفہ دینا چاہتے ہو تو اخلاق سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں۔
- اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری اولاد تمھاری خدمت کرے تو آج اپنے ماں باپ کی خدمت کرو۔
- کسی کو دھوکا مت دینا۔ کل کوئی تمھیں دھوکا دے گا۔
- غریب سے نفرت مت کرو کیا پتہ کل تم بھی غریب ہو جاؤ۔
- ہمیشہ منہ سے اچھی بات نکالو کیونکہ دن میں ایک وقت قبولیت کا ہوتا ہے کہ اس میں کہی ہوئی بات سچ نکلتی ہے۔
- غریب ہے وہ شخص جو علم کے نور سے مالا مال نہیں۔
- اگر کوئی آپ سے بداخلاقی سے پیش آتا ہے تو آپ اسے نرم رویے سے شرمندہ کردیں۔
- کبھی کسی شخص کی باتیں کسی دوسرے شخص کے کانوں میں مت ڈالو اس سے زمین میں بڑے بڑے فساد پیدا ہوتے ہیں۔

■

Sadia Kausar Shaikh Haroon Qureishi
Osama Urdu High School & Junior College
Bhusawal (Maharashtra)

سنہرے موتی

- مصیبت کی شکایت سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے خدا ناراض، دشمن خوش اور دوست غمگین ہوتا ہے۔
- نیک خواہشات انسان کے ذہن کو تسلی دیتی ہیں۔
- داناؤں کا کہنا ماننے والا کبھی بھی ناکام نہیں ہوتا۔
- اللہ کی عبادت ہر غم کا بہترین علاج ہے۔
- تنہا انسان یادوں کے زخموں میں الجھا رہتا ہے۔
- جو دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں وہ عظیم لوگ ہیں۔
- وقت خدا کی امانت ہے اس کو ضائع کرنا خیانت ہے۔
- صرف نیک ہی نہ بنیے بلکہ کسی کے ساتھ نیکی بھی کیجیے۔
- لوگوں کے ساتھ مہربانی سے ملنا دعوت دینے کی نسبت بہتر ہے۔

■

Sarfaraz Khan
Borgaon Manju
Akola (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کرسکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کرلیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

ایک صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ اپنی بیگم کے ہمراہ کار پر کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں کار کے آگے ایک گدھا آگیا۔ ان صاحب نے کار روکی اور بیگم سے بولے۔ اپنے رشتہ دار کو کہو... راستے سے ہٹ جائے۔

بیگم نے کھڑکی سے گردن نکال کر کہا... دیور جی... ذرا راستہ دے دو۔

ڈاکٹر پہلوان سے۔ آپ کا کندھا کیسے اتر گیا۔

پہلوان: غلطی سے اپنے بچے کا بستہ اٹھا لیا تھا۔

ایک صاحب اپنے ایک زمیندار دوست کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ ایک دن زمیندار دوست نے ان سے کہا۔ مجھے شہر میں کام ہے اگر تم چاہو تو رائفل اور دو کتے لے کر جنگل چلے جاؤ اور اپنا نشانہ آزماؤ۔

وہ صاحب رائفل اور کتے لے کر جنگل گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آگئے۔

کوئی اور چیز چاہیے۔ زمیندار نے پوچھا۔

ہاں......اور کتے ہوں تو دے دیجیے...... میرا نشانہ ٹھیک ٹھاک لگا ہے۔ دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

ایک صاحب بڑے غصہ میں دودھ والے سے بولے، آج کیسا دودھ تھا کہ سارا پھٹ گیا۔

دودھ والا: جناب میں کیا کرتا گائے نے رات لیموں زیادہ کھالی تھی۔

گڈو پپو سے۔ آدمی کے مقابلے گھوڑے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔

پپو گڈو سے۔ وہ کیسے؟

گڈو پپو سے۔ کیونکہ جب گھوڑوں کی دوڑ ہوتی ہے تو ہزاروں آدمی وہاں ان کی ریس دیکھنے پہنچتے ہیں لیکن جب آدمیوں کی دوڑ ہوتی ہے تو وہاں ایک بھی گھوڑا نہیں پہنچتا۔

دودھ والا۔ مالکن کل سے دودھ ایک روپے مہنگا ہو جائے گا۔

مالکن: کیوں؟ دودھ کے دام کیوں بڑھا رہے ہو؟

دودھ والا: کیونکہ مجھے اب پانی کا بل بھرنا پڑتا ہے۔

دو بیوقوف بازار سے گزر رہے تھے۔ راستے میں 'برف' کی ایجنسی کا بورڈ لکھا ہوا دیکھ کر ٹھہر گئے۔

پہلا: کیا وجہ ہے برف کے لفظ کو موٹا کر کے لکھا ہے؟ اور باقی حروف چھوٹے ہیں۔

دوسرا: بھائی یہ پگھلنے والی چیز جو ہوئی۔

■ رمشا شیخ رئیس

ایمانداری اور صبر کا پھل

ایک گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا جو بہت ہی غریب تھا۔ اُس کا ایک کھیت تھا۔ دونوں لڑکیاں جوان ہوتی جارہی تھیں اور اس کسان پر بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ کسان سوچتا تھا کہ اب ان دونوں کی شادی کروانی ہے۔ کسان دن رات محنت کر کے پیسہ کماتا تھا اور اپنی لڑکیوں کی شادی کے جہیز کے لیے پیسہ جمع کرتا تھا۔ بہت مشکل سے زندگی کا گزارا ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ غریبی کی وجہ سے دونوں بیٹیوں کا رشتہ نہیں آتا تھا۔ اس لیے کسان بہت فکرمند اور پریشان رہتا تھا۔ ایک دن وہ کھیت میں جاکر کام کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک درخت کے پاس گئی۔ اسے کچھ چمکتا دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا کہ سونے کی انگوٹھی پڑی ہے جو بہت قیمتی تھی۔ کسان اس انگوٹھی کو گھر لے گیا۔ اس کی بیوی دیکھ کر حیران ہوگئی کہ یہ سونے کی اتنی قیمتی انگوٹھی۔

اُسی گاؤں میں ایک راجا رہتا تھا۔ اس کے دو بھائی تھے۔ کسان کو جو انگوٹھی ملی تھی وہ راجا ہی کی تھی۔ راجا کے ہاتھ سے گر کر کہیں کھو گئی تھی۔ راجا کی انگوٹھی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ راجا نے غصے میں آکر سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ اگر دو دن کے اندر انگوٹھی نہیں مل سکی تو تمھارا سر کاٹ دیا جائے گا۔ سپاہی اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ محل کے باہر بھی دیکھا مگر کہیں نہیں ملی۔ اسی دوران کسان کھیت میں جارہا تھا۔ دو آدمی باتیں کررہے تھے کہ راجا اپنی فوج کے ساتھ جنگ سے واپس لوٹ رہا تھا تو راستے میں کہیں سونے کی انگوٹھی کھو گئی کسان نے یہ بات سنی اور گھر جاکر اپنی بیوی کو بتایا۔ کسان کی بیوی نے کہا کہ راجا کے محل میں جاکر یہ انگوٹھی اسے دے دو۔ ویسے بھی اس انگوٹھی کا ہم کیا کریں گے۔ کسان نے سوچا کہ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس نے ویسا ہی کیا۔ محل میں جاکر راجا سے کہا کہ یہ تمھاری قیمتی انگوٹھی میرے کھیت میں گر گئی تھی۔ پھر جب میں دوسرے دن کھیت میں جارہا تھا تو انگوٹھی کے بارے میں دو لوگوں کی بات چیت سن کر میں لے آیا۔ یہ لیجیے آپ کی انگوٹھی۔ راجا نے کسان کو اپنے ہی محل میں نوکری دے دی۔ کسان نے کسی موقع پر راجا سے کہا کہ گاؤں کے لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ مذاق اڑاتے ہیں مگر میں صبر کرتا ہوں۔ کسان کی یہ عادت راجا کو بہت پسند آئی۔ اس کی ایمانداری سے بھی راجا بہت خوش ہوا۔ راجا نے اپنے دونوں بھائیوں کی شادی کسان کی دونوں لڑکیوں سے کروادی۔ کسان کا دل باغ باغ ہوگیا اور ساری فکر دور ہوگئی۔

اس طرح کسان کی ایمانداری اور صبر کی وجہ سے خدا نے اسے خوش حال زندگی عطا فرمائی۔

■

Rimsha Shaikh
Class (IXC), Anglo Urdu High School
Dhule, Maharashtra

انصاری اعجاز احمد حفظ الرحمن

سچا دوست

آج اسکول آتے ہوئے مجھے دیر ہوگئی تھی۔ جیسے ہی میں اسکول پہنچا سر کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ میں نے اندر آنے کی اجازت لی اور کلاس میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ کلاس میں ایک نیا لڑکا بیٹھا تھا۔

اسکول کی ریس میں گھنٹی بجی۔ سب بچے کلاس سے باہر نکلنے لگے۔ میں اس لڑکے کے پاس گیا اور اس سے پوچھا "کیا تمھارا یہاں نیا داخلہ ہے؟" مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "میں تمھارا دوست ہوں تم مجھے بتا سکتے ہو۔" اس نے کہنا شروع کیا "میرا نام رفیق ہے۔ یہاں میرا نیا داخلہ ہوا ہے۔ میرے امی ابو نہیں ہیں، اس لیے میں اپنی دادی کے ساتھ رہتا ہوں۔ دراصل جب تم نے مجھ سے پوچھا تو میں یہ سمجھا کہ تم ایک شرارتی لڑکے ہو اور تم میرا مذاق اڑاؤ گے اس لیے میں بولنے میں ڈر رہا تھا۔" میں نے کہا "ارے مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تم دوست ہی سمجھو میرا نام ذیشان ہے۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ گھنٹی دوبارہ بجی اور ہم سب پھر کلاس میں بیٹھ گئے۔

ہم روز اسکول میں ملنے لگے، باتیں کرنے لگے۔ اب ہم اچھے دوست بن گئے تھے۔ ایک دن جب میں اسکول پہنچا تو دیکھا کہ رفیق وہاں نہیں ہے میں پورے دن سوچتا رہا کہ آخر رفیق اسکول کیوں نہیں آیا؟ کیا اس کی طبیعت خراب ہے یا اس کا کہیں اور داخلہ ہو گیا ہے۔

اسکول کی چھٹی کے فوراً بعد میں رفیق کے گھر گیا۔ رفیق کے پڑوسیوں سے پتہ لگایا کہ رفیق کی دادی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے، اسپتال کا پتہ لے کر میں اسپتال پہنچا، وہاں میں نے دیکھا کہ رفیق اپنی دادی کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا "رومت اب میں آگیا ہوں اب ہم دونوں مل کر دادی کی تیمارداری کریں گے۔ اور دیکھنا دادی جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ہم دونوں مل کر دادی کی تیمارداری کرنے لگے۔ ڈاکٹر کی دواؤں اور ہماری دعاؤں سے دادی جلد ٹھیک ہوگئی۔ "تمھارا بہت بہت شکریہ ذیشان۔" رفیق نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "ارے اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ دادی جلد ٹھیک ہو جائے گی، ہوگئی نا۔" رفیق کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آگئی جیسے وہ کہہ رہا ہو تم میرے سچے دوست ہو۔"

■

Ansari Ajaz Ahmad Hifzurraheman
Class: VIIIth, Alshabab Urdu Primry School
Milat Nagar
Dhule - 424001 (Maharashtra)

بچوں کی دنیا

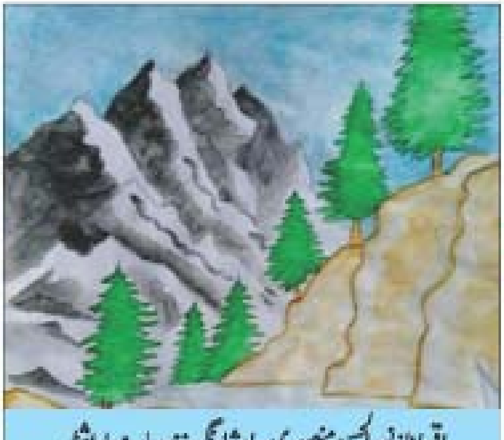

اقرا ناز نورالحسن منصوری، بادشاہ نگر، نندوبار، مہاراشٹر

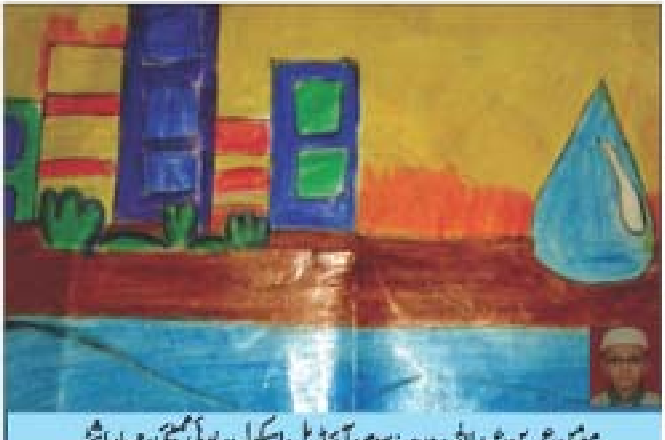

مومن عمرین عبداللہ، درجہ: سوم، آئیڈیل اسکول، پوئی ممبئی، مہاراشٹر

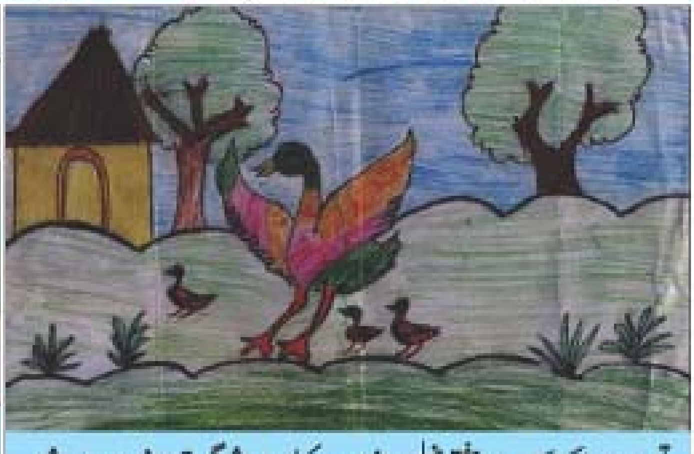

تحرین عذیفہ کھاٹک درجہ: ہفتم، ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، تعلقہ شیرپور، مہاراشٹر

الفیہ پروین سلیم خان، درجہ ہشتم
ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، نادورہ، بلڈانہ، مہاراشٹر

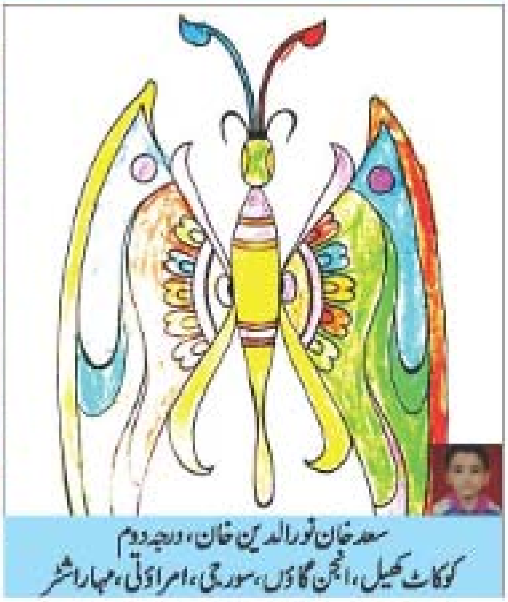

سعد خان نورالدین خان، درجہ دوم
کوکاٹ کھیل، انجن گاؤں، سورجی، امراوتی، مہاراشٹر

آفتاب خان داؤد خان، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، نادورہ، بلڈانہ، مہاراشٹر

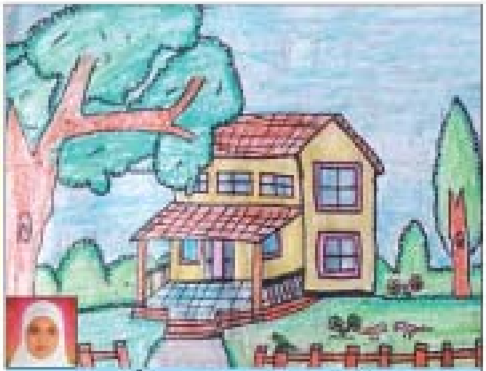

آفرین پروین سعید خان، درجہ ہشتم
ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، نادورہ، بلڈانہ، مہاراشٹر

سوہت شیخ وسیم، درجہ نہم بی، ملت ہائی اسکول، مہرن

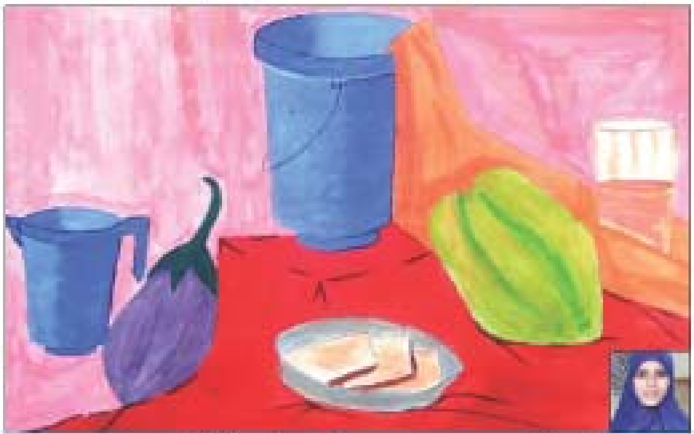

فرزانہ شمس الدین انصاری، درجہ نہم بی، ملت ہائی اسکول، مہرن

شائستہ انجم شیخ محی الدین
ضلع پریشد ہائی اسکول کرکھیلی، ناندیڑ، مہاراشٹر

فلک جبین، برائٹ کوچنگ سینٹر، ریل پار، آسنسول، بنگال

عرشین شیخ آصف، مولوی گنج، البنات اردو ہائی اسکول

facebook اردو فیس بک

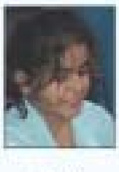

میرا نام زونا زین ہے، میں زید پبلک اسکول میں درجہ پنجم میں پڑھتی ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' سے مجھے بہت دلچسپی ہے۔ میں انتظار کرتی ہوں کہ یہ میگزین کب میرے گھر پہنچے۔ میرے پاپا ہفت روزہ 'مسلم دنیا' کے ایڈیٹر ہیں۔ ہمارے گھر میں اردو کا ماحول ہے۔

زونا زین، درجہ پنجم، زید پبلک اسکول، شاہین باغ، نئی دہلی

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اگست 2017 موصول ہوا۔ اس شمارے میں اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اگست کا شمارہ مجھے بہت زیادہ پسند آیا، کیونکہ اس میں جشن آزادی سے متعلق بہت اچھی نظمیں اور کہانیاں ہیں۔ بھلا بتایئے تو، چالاک مصور، محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ یہ تحریریں مجھے خصوصی طور پر پسند آئیں۔

شاکلہ ارم محمد اعجاز، جی این آزاد اردو جونیئر کالج، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

میں غلام نبی آزاد اردو جونیئر کالج کی طالبہ ہوں۔ مجھے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' بے حد پسند ہے۔ میں ہر ماہ یہ پرچہ خرید کر پڑھتی ہوں۔ بچوں کے لیے بچوں کی دنیا بہت دلچسپ ہے۔ اس میں سبق آموز باتیں ہوتی ہیں۔ کہانیاں، ڈرامے، خوبصورت نظمیں اور ہنسی کے غبارے ہوتے ہیں۔ ہمارے اسکول اور جونیئر کالج کے بہت سے طالب علم اس پرچے کا خرید کر مطالعہ کرتے ہیں۔

سمیہ آفرین محمد ذاکر، جی این آزاد اردو ہائی اسکول، باڑیگاؤں، اکولہ، مہاراشٹر

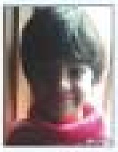

میں عائشہ شمسی درجہ اوّل میں پڑھتی ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ میں اسے بہت دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ میں پاپا کو 'بچوں کی دنیا' لانے کی ضد کرتی رہتی ہوں۔ میرے پاپا ڈاکٹر زین شمسی اور ماں حنا کوثر ہیں۔

عائشہ شمسی، درجہ اوّل، زید پبلک اسکول، شاہین باغ، نئی دہلی

میرا نام عبدالوہاب ہے۔ میری عمر ابھی صرف چار سال ہے۔ میں اب اسکول جانے لگا ہوں۔ ابھی میں بچوں کی دنیا خود سے نہیں پڑھ پاتا۔ اس لیے میرے بھائی اور بہن مجھے اس کی کہانیاں پڑھ کر سناتے ہیں۔ مجھے اس کی رنگ برنگی تصویریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو خود سے اس کی مزے دار کہانیاں اور نظمیں پڑھ سکوں گا اور اپنے چھوٹے بھائی عبداللہ کو بھی پڑھ کر سناؤں گا۔

عبدالوہاب، اقبال پبلک اسکول، مئوناتھ بھنجن، یوپی

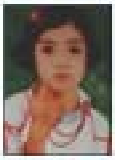

میں درجہ چہارم کی طالبہ ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کا ہر ماہ انتظار کرتی ہوں۔ مجھے یہ میگزین بے حد پسند ہے۔ میں اس کے ہر مضمون کو پوری دلچسپی اور خوشی سے پڑھتی ہوں۔ مجھے اس کے مطالعہ میں بہت مزہ آتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے ذریعہ ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔

ایمن صدیقہ بنت عبدالرشید، بڑھئی پورہ، منگرول پیر، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

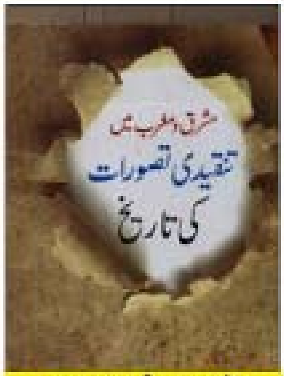

صفحات: 373، قیمت: [illegible] روپے

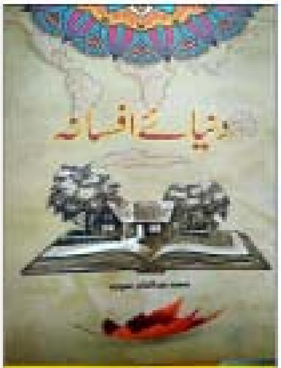

صفحات: 131، قیمت: [illegible] روپے

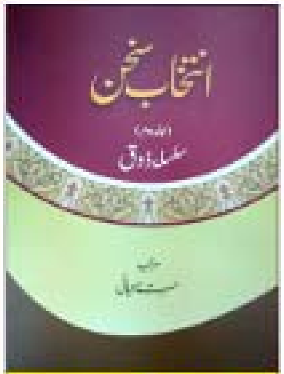

صفحات: 321، قیمت: 55 روپے

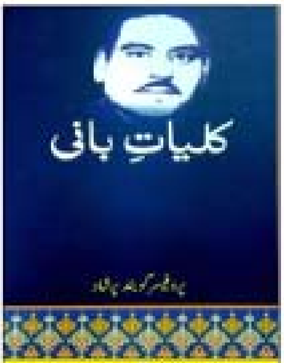

صفحات: 383، قیمت: 180 روپے

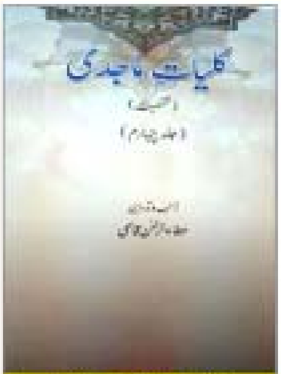

صفحات: [illegible]، قیمت: 290 روپے

صفحات: 125، قیمت: [illegible] روپے

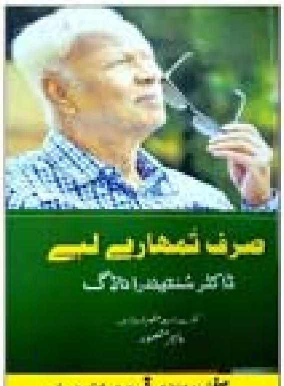

صفحات: [illegible]، قیمت: 55 روپے

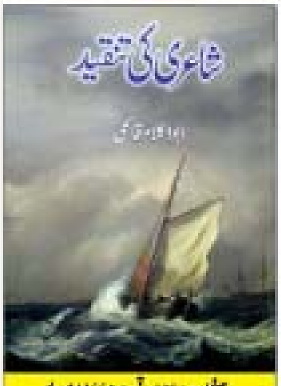

صفحات: [illegible]، قیمت: 155 روپے

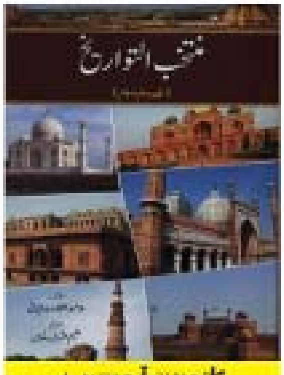

صفحات: [illegible]، قیمت: [illegible] روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 sales@ncpul.in, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

BACHON KI DUNIYA Monthly, March 2018, Vol. 06, Issue: 03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/02/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

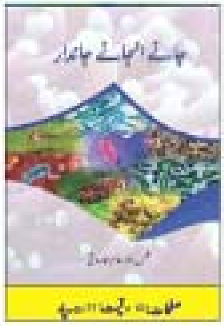
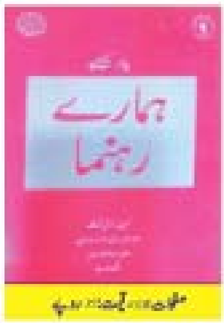

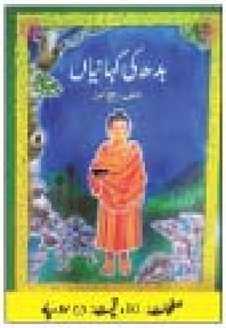
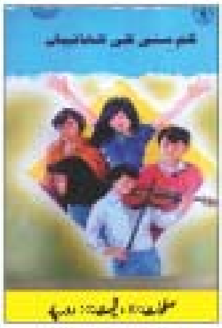
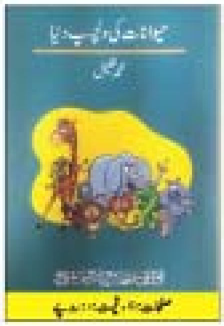
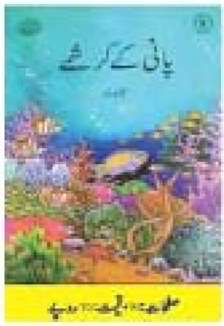

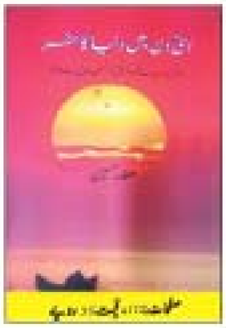
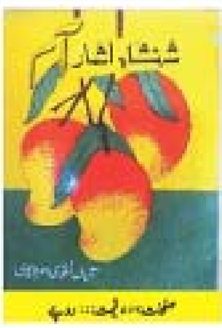

خریداری کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.